میر بلوچ

پشتو ادب کی تاریخ

(1947 تا حال)

ڈاکٹر حنیف خلیل

اکادمی ادبیات پاکستان

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

پشتو ادب کی تاریخ

(1947 تا حال)

ڈاکٹر حنیف خلیل

پشتو ادب کی تاریخ

(1947 تا حال)

ڈاکٹر حنیف خلیل

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

نگران اعلیٰ : ڈاکٹر یوسف خشک

مدیر اعلیٰ : محمد عاصم بٹ

تحریر : ڈاکٹر حنیف خلیل

نظر ثانی : ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار

طباعت : اختر رضا سلیمی

تعداد : 500

ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد

مطبع : [illegible] پریس، اسلام آباد

قیمت : مجلد: 300/- روپے

غیر مجلد: 275/- روپے

ISBN:978-969-472-542-0

Pushto Adab ki Taareekh

Written By
Dr. Muhammad Hanif Khalil

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Islamabad, Pakistan

فہرست

پیش نامہ

پاکستان کی 75ویں سال گرہ کے موقع پر اکادمی ادبیات پاکستان نے پاکستانی زبانوں کے ادب کی (1947 تا حال) تاریخیں لکھوانے کا منصوبہ جاری کیا ہے۔ پشتو ادب کی تاریخ اسی منصوبے کے تحت شائع کی جا رہی ہے۔

پشتو کا شمار پاکستان کی قدیم ہند یورپی زبانوں میں ہوتا ہے۔ یہ امر باعث افتخار ہے کہ پشتو زبان و ادب کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے جسے نہایت اعلیٰ ادیب میسر آئے جنھوں نے اپنی علمی و ادبی کاوشوں سے دنیا بھر میں اس زبان کے ادب کا شہرہ کیا۔

وہ خوش حال خان خٹک ہوں یا غنی خان یا زیتون بانو، پشتو ادب ہر دور میں ثروت مند رہا۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس پودے میں کئی اور رنگ رنگ کے پھولوں کا اضافہ ہوا۔ اس میں آزادی، قومیت، حب الوطنی اور ہمہ گیریت کے رنگ شامل ہوئے۔ آج پشتو ادب جدت، جدید تجربوں اور رویوں کے اظہار کا وسیلہ بنا ہوا اور اس کا آسمان روشن ستاروں کے جھرمٹ سے سجا ہوا ہے۔

ڈاکٹر حنیف خلیل پشتو زبان کے معتبر نقاد اور محقق ہیں۔ آپ پشتو زبان و ادب کی تدریس سے بھی وابستہ ہیں۔ اس کتاب میں ان کی اس زبان کے ادب کی تاریخ پر گہری نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے جس نے اس دستاویز کو ایک اعلیٰ علمی حیثیت عطا کی ہے۔ انھوں نے جدید پشتو ادب کی تاریخ کے سبھی اہم پہلوؤں کو اس کتاب میں بحث اور تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عام قارئین کے ساتھ طلبا اور اساتذہ کے لیے بھی ایک حوالے کی حیثیت اختیار کرے گی۔

ہمیں امید ہے کہ اس منصوبہ کی دیگر کتب کی طرح یہ کتاب بھی قارئین کے ذوق پر پوری اترے گی۔ اس منصوبہ کو عملی تعبیر دینے کے لیے ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار، عزیز رفیق محمد عاصم بٹ، ڈائریکٹر/چیف ایڈیٹر، اور اختر رضا سلیمی کی کاوشیں لائق صد تحسین ہیں۔

ڈاکٹر یوسف خشک، میریٹوریس پروفیسر
چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

عرضِ خلیل

پاکستانی زبانوں میں اکثر و بیشتر کی ادبی تواریخ میں جدید ادب کا حصہ بہت کم ہی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہی صورت حال پشتو زبان و ادب سے متعلقہ ادبی تواریخ کا بھی ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کا منصوبہ پاکستانی زبانوں کے ادبیات کی کہانی لائق تحسین ہے جس کے تحت تمام بڑی زبانوں کی تواریخ کو از سرِ نو ترتیب دیا جا رہا ہے۔ جس میں جدید ادبیات کا بھی عہد بہ عہد جائزہ لینے کا موقع میسر آتا ہے۔

اسی سلسلے میں مجھے پشتو ادب کی کہانی (پشتو ادب کی تاریخ) 1947 تا 2022 کا منصوبہ دیا گیا تھا جس کی تکمیل زیرِ نظر کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ پشتو ادب کی کئی تواریخ موجود ہیں جن میں قیام پاکستان کے بعد کے تاریخی سفر کا جائزہ عمومی طور پر معدوم ہے۔

میں اکادمی ادبیات کے صدر نشین جناب ڈاکٹر یوسف خشک اور اس تحقیقی منصوبے کے نگران جناب محمد عاصم بٹ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے موقع فراہم کیا کہ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر پاکستان کی بڑی زبان پشتو ادب کی کہانی (1947 تا 2022) نئے زاویے سے لکھ سکوں اور قارئین کی نذر کر سکوں۔ اس کتاب میں پشتو ادب کی مختلف اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ گذشتہ 75 برسوں میں پشتو ادب کے تحقیقی و تنقیدی سفر کے علاوہ تخلیقی سطح پر بھی تمام منظوم و منثور اصناف کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ تمہیدی مباحث میں مختصر طور پر مذکورہ اصناف کے آغاز و ارتقاء کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے مگر بنیادی طور پر ان اصناف و رجحانات کا قیام پاکستان کے بعد 75 سالہ ارتقاء کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کئی اصناف کے منتخب نمونے بھی دیے گئے ہیں اور ساتھ ہی تبصرہ و تجزیہ شامل کر دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب کی نوعیت بھی ''پشتو ادب کی تاریخ'' کی ہے مگر اس تاریخ اور پشتو ادب کی کہانی میں چونکہ 1947 کے بعد کے دور کو مدِنظر رکھا گیا ہے اس لئے ہم اس کو پشتو کی جدید ادب کی تاریخ کہہ سکتے ہیں

۔ یہ مختصر کتاب اس امید کے ساتھ قارئین کی نذر کرتا ہوں کہ پشتو ادب سے وابستہ علمی وادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ ادب کے مختلف سطحوں کے طلباء بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ میں اس موقع پر اپنے رفقاء، جوہر خلیل، شبیر احمد خلیل اور ڈاکٹر شہاب عزیز ارمان کی معاونت کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور اکادمی ادبیات پاکستان کے اس تحقیقی منصوبہ کی بھی تحسین کرتا ہوں۔

ڈاکٹر حنیف خلیل

ڈائریکٹر

قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان

قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد

پشتو ادب

آغاز تا آزادی پاکستان تک: (اجمالی جائزہ)

پشتو زبان کی قدامت کم وبیش پانچ ہزار سال پرانی بتائی جاتی ہے۔ ویدی ادب کے حوالے سے بھی تقریباً چار ہزار سال سے پشتو کی موجودگی ثابت ہے مگر اتنی قدیم زبان میں ادب اور تحریری سرمایہ بہت بعد کے زمانے کا ملتا ہے۔ پٹہ خزانہ کی روایت سے معلوم تاریخ کے مطابق پہلا شاعر امیر کروڑ 139ھ کا ہے جس کے کلام کے نمونے دستیاب ہیں مگر پشتو ادب کے کچھ آثار قدیم زمانے سے بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند محققین نے پرانے کتبوں پر کندہ تحریروں کو پشتو کا ابتدائی تحریری سرمایہ گردانا ہے اور کچھ لوگ پشتو کے عوامی ادب (سوانکورہ) میں سے پشتو ٹپہ کو پشتو ادب کا قدیم ترین سرمایہ مانتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پشتون قبائلی زندگی گزارتے ہوئے طویل عرصہ تک جنگ وجدل میں مصروف رہے اور بہت بعد میں تحریر کی طرف راغب ہوئے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے تحریری سرمایہ کا سراغ کافی قدیم زمانہ سے ملتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر پریشان خٹک کی رائے قابل غور ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب "پشتو شاعری کی تاریخ" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

پشتو شاعری کا آغاز کب ہوا؟ یہ جاننے کے لئے ہمیں ہزاروں سال پیچھے جانا پڑے گا۔ اس دور کی طرف جب قبائلی نظام میں بٹے ہوئے پشتون خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے۔ تحریر کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور پشتو زبان ایک بولی کی حیثیت سے زندہ تھی تاہم پشتو شاعری اس وقت بھی یقیناً موجود تھی کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ فلک بوس پہاڑوں، خوبصورت آبشاروں، شفاف جھیلوں اور شاداب وادیوں کے اس جنت نظیر خطے میں جہاں فطرت خود شاعری کرتی نظر آتی ہے وہاں کے باسیوں نے نغمے نہ الاپے ہوں یا گیت نہ گائے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں پشتو شاعری کا تحریری ثبوت

۱۳۹ ہجری سے پہلے نہیں ملتا(۱)

اس پس منظر میں جب پشتو عوامی ادب اور شاعری کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو پشتو ٹپہ کو اسی ویدی ادب کے زمانے سے منسوب کیا جاتا ہے جس کو آج سے تقریباً چار ہزار سال پرانا تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈنمارک کے محقق جینز اونولڈسن (Jens Enevoldson) نے پشتو ٹپہ کے بارے میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے جس میں انہوں نے پشتو ٹپہ کو آریائی دور سے منسوب کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> The ancient Aryans when composing their religious hymns gave much consideration to mere, and stress. The comon metre is called sloka. It consists of 24 syllables in tow lines, which were eighter equal length(12syllables each) or unequal length, but always 24 syllables. I am fond of imagining that we have, in the tappa with its 22 syllables in an even more rigid metre (9+13), an example of a unique Aryan metre just as old or older, and today peculier to Pakhto only. This may even be born out by the contents of some of the tappas e.g. 101, which tells us about girls going to the top of a mountain at nighttime to cut flowerf there is no parallel to such a custom among Pakhtoons today. But one of the central rituals in the Vedic religion concerns the somaplant, from which an intoxicating drink was extraced. And at certain times of the year the young girls went by night to the mountains, where this plant grew, to dance and harvest the sacred flower. There is in Upper Swat a mountian called the 'da djuno sar' (the girls' mountain) by the local people, and I am told that on top of this mountain the soma-plant may be found even today! Taken together then, Pakhto proverbs and tappas are like

two sides of the same coin, stamped with the image of the soul (۲)of a people

یہی ڈاکٹر پروفیسر محمد نواز طاہر نے اپنی کتاب "پشتو زبان و ادب ایک مطالعہ" میں دیا ہے اور لکھا ہے!

اوستا اور سنسکرت کے مذہبی گیت قدیم زمانہ کے انسانوں کی روحانی تسکین و تشفی کا باعث بنے رہے ہیں ان کی تخلیق اس وقت کے انسان کی روحانی حوائج کے پیش نظر ہوئی۔ اگرچہ ان منظوم گیتوں کا انداز بھی عوامی تھا اور اس کی اپنی مخصوص طرز ہوا کرتی تھی۔ جو لوگ سینہ بہ سینہ یاد کرتے چلے آتے اور فی الحقیقت یہی گیت ان کی روح کی آواز ہوا کرتی تھی جو اس زمانے اور اس ماحول کے پیدا کردہ تھے لیکن جب سے ان کو مذہبی تقدس حاصل ہو گیا تو عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹ گیا اور اس پر ایک مخصوص گوت یا فرقے کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ تعلق اور لاتعلقی کے اس عمل میں عام لوگوں کے جذبات و افکار کی ترجمانی کیلئے اس زمانے میں پشتو زبان میں شعر و شاعری کی جو اصناف و اوزان وضع کئے گئے ان میں پشتہ سپہ، غاڑہ اور نکو غاس زبان کے قدیم ادوار کی یادگار ہیں۔ جب رگ وید کے اشلوکوں میں سوما کے متبرک پودے کے تقدس کے گیت شامل کیے جا رہے تھے۔

سپوږمیه کونک د هه داخیږه
یار مے د گلو تو کوی کوتے ریبینه

"اے چاند ذرا جھلک کر نکل آ۔ میرا محبوب پھولوں کی تنائی میں مگن ہے، مجھے ڈر ہے کہیں وہ اپنی انگلیاں نہ کاٹ ڈالے"

پشتو شعر و شاعری کی یہ تمام اصناف سخن مکمل طور پر عوامی اور ہر کسی کے لئے تھیں۔ چونکہ ان پر کسی خاص طبقہ یا فرقہ کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکی اور نہ ان پر موضوع اور مضمون کی پابندی عائد کی گئی۔ اس لئے تمام پشتونوں میں ان کو عالمگیر اور دائمی مقبولیت حاصل رہی۔

بعض محققین کی رائے ہے کہ رگ وید کے اشلوک پشتو ٹپے کے انداز میں ہوا کرتے تھے اور چونکہ یہ بھی اسی ماحول میں پیدا ہوئے تھے اس لئے یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان کی زبان بھی پشتو کی اس قدیم شکل سے قریب تر ہو جس زبان میں اس دور کا پشتون چرواہا اور گڈریا لہک لہک کر گایا کرتا اور اپنے دل اور روح کے لئے تسکین و تسلی کا سامان فراہم کرتا تھا۔ ویدوں کے علماء کا دعویٰ ہے کہ تمام حکمت

موضوعات پر انسانی افکار ویدوں کی مقدس کتابوں میں موجود ہیں اور ان کی تخلیق کا ماحول بھی وہی ہے جہاں پر آریا قبائل پہلے آباد رہے۔ ایشیاء کے شمال مغربی مرغزاروں سے ہجرت کرنے کے بعد ان کا ٹھکانہ دریائے آمو اور دریائے سندھ کے درمیان واقع باختر کی وہ سرزمین تھی جس میں آج بھی پشتون نسل کے بے شمار قبائل آباد ہیں۔ موضوعات کے تنوع اور ماحول کی ہم رنگی کی ہر شے کے لحاظ سے پشتو ٹپہ ان سے مشابہ بتایا جاتا ہے اور اسی مشابہت کے پیش نظر جدید افغانستان کے بعض علماء کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ شاید ویدوں کی اصل پشتو ٹپے سے ماخوذ ہے (۳)

اس ابتدائی پیش منظر کے بعد پشتو ادب کے تحریری سرمایہ کا دور آتا ہے جس کا آغاز امیر کروڑ کی شکل میں 139ھ سے ہوتا ہے۔ پٹہ خزانہ کی روایت کے مطابق 139ھ سے لے کر 900ھ تک کئی شعراء گذرے ہیں جن کا اجمالی تذکرہ میں نے اپنی کتاب "اردو کی تشکیل میں پشتونوں کا کردار" میں یوں کیا تھا۔

"امیر کامل شاہ کے زمانے میں غور میں پشتو زبان کا عظیم شاعر امیر کروڑ زندہ تھا۔ یہ غور کے بادشاہ امیر فولاد کا لڑکا تھا۔ کتاب پٹہ خزانہ میں تاریخ سوری کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ یہ امیر پشت با پشت سے غور میں آباد تھے اور سوری اولاد سے تھے جو ضحاک کی نسل سے تھا۔ امیر کروڑ 139ھ میں غور اور مندیش کا بادشاہ تھا اور پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ موصوف پشتو زبان کے معلوم شاعروں میں سب سے پہلا بلند پایہ شاعر گزرا ہے یہ اپنے دور کے صاحب سیف وقلم تھے۔ امیر کروڑ کے بعد پشتو ادب کے اس دور کا آغاز ہوتا ہے جو اسلامی تعلیمات کی ترویج واشاعت کے باعث فارسی اور عربی زبانوں سے بے حد متاثر ہے۔ یہاں تک کہ اس دور میں انہی زبانوں کی مختلف اصناف سخن کو اپنایا گیا اور رفتہ رفتہ پشتو کے اس کتابی ادب کو فروغ حاصل ہونے لگا جس کی تمام اصناف سخن ان دونوں زبانوں سے مستعار لی گئی ہیں۔ اس زمانہ میں نثر لکھنے کا رواج بھی عام ہو گیا اور تاریخ وادب اور اسلامی تعلیمات پر پشتو نثر میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس دور کے چند مشہور شاعروں کے نام حسب ذیل ہیں:

شیخ رضی لودھی ۳۱۱ھ مطابق ۹۲۳ء، شیخ بیٹنی ۴۰۰ھ مطابق ۱۰۰۹ء،
شیخ اسماعیل سڑبنے ۴۰۰ھ مطابق ۱۰۰۹ء، خرشبون ۴۱۱ھ مطابق ۱۰۲۰ء،
اسعد سوری ۴۲۵ھ مطابق ۱۰۳۳ء، طائمنی ۵۶۰ھ مطابق ۱۱۶۴ء، ملک
یار غرشین ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۸۵ء، شکارندوے ۵۸۰ھ مطابق ۱۱۸۴ء

قطب الدین بختیار کاکی ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۳ء، شیخ متی ۶۸۸ھ مطابق
۱۲۸۹ء، بابا ہوتک ۷۴۰ھ مطابق ۱۳۳۹ء، شیخ ملک یار ۷۳۹ھ مطابق
۱۳۳۸ء، اکبر زمینداوری ۷۸۰ھ مطابق ۱۳۶۹ء، سلطان بہلول لودھی
۸۹۳ھ مطابق ۱۴۸۸ء، خلیل خان نیازی ۸۹۳ھ مطابق ۱۴۸۸ء، شیخ
محمد صالح ۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۴ء، بی بی زرغونہ ۹۰۳ھ مطابق ۱۴۹۷ء،
زرغون خان ۹۱۲ھ مطابق ۱۵۰۶ء، دوست محمد کاکڑ ۱۰۲۹ھ مطابق
۱۶۲۲ء، ارزانی ۹۶۰ھ مطابق ۱۵۵۲ء، خواجو طیرے (یوسفزے)
۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۲۲ء، مرزا خان انصاری ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۰ء،
دولت لوانی، علامت زمند مخلص اور واصل ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۰ء (۲)

یہ وہ شعراء ہیں جن کے بارے میں مختلف تذکروں میں لکھا گیا ہے۔ان میں سے بیشتر شعراء کا بنیادی ماخذ کتاب "پٹہ خزانہ" ہے جس کی علمی اور تحقیقی حیثیت پر کچھ محققین نے اعتراضات بھی اٹھائے ہیں مگر مجموعی طور پر پٹہ خزانہ کو پشتو کے قدیم شعراء کا بنیادی ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پٹہ خزانہ کے علاوہ چند تذکرے اور تذکرہ اولیا قدیم پشتون شعراء کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔

900ھ کے بعد پشتو ادب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو تقریباً سو سال پر محیط ہے۔اس دور کو روشنیہ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس دور میں پشتو کی کلاسیکی روایت کی بنیاد پڑی اور اسی دور میں پشتو میں نثری سرمایہ کتابی صورت میں بایزید انصاری کی کتاب خیرالبیان کی صورت میں سامنے آیا۔ یہی وہ دور ہے جس میں پشتو کے کلاسیکی شعراء سامنے آئے۔ پشتو ادب کے اس دور میں اخون درویزہ کی کتاب مخزن الاسلام نے شہرت پائی اور اخون درویزہ کی جانب سے روشنیہ عقاید کی مخالفت بھی سامنے آئی۔اس دور کے ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے اپنی اردو کتاب "مختصر تاریخ۔ زبان و ادب پشتو" میں چند چیدہ چیدہ خصوصیات بیان کیں جن کا تذکرہ یہاں کرنا بے سود نہیں ہوگا۔

اس دور کے ادب کی کچھ خصوصیات ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ صحیح معنوں میں پشتو کے کلاسیکی ادب کا آغاز ہی روشنیہ تحریک سے وابستہ لکھنے والوں نے کیا ہے۔اس دور میں پشتو نثر کی پہلی دستیاب کتاب سامنے آئی۔ پشتو کلاسیکی شاعری کے پہلے صاحب دیوان اور صاحب کتاب شعراء اسی تحریک سے وابستہ ہیں۔ پشتو نثر میں رواں نثر، مسجع مقفی اور مرصع نثر وغیرہ کے نمونے اس دور میں

دریافت ہوئے۔ پشتو شعر و ادب میں تصوف کے باقاعدہ اور انمٹ اثرات اور پیر روشن کی جانب سے
صوفیانہ اصطلاحات میں اضافے اور اختراعات اسی دور میں نمودار ہوئیں۔ روشنیہ تحریک اور اس کی
مخالفت میں تخلیق ہونے والا ادبی اور کتابی ذخیرہ وجود میں آیا۔ لسانی نشیب و فراز، رسم الخط اور پشتو کے
مختلف لہجوں کے بارے میں کافی معلومات اس دور کے ادب میں سامنے آئیں۔ اس دور کے ادب سے
عصری رجحانات، سیاسیات، سماجیات اور مذہبی عقائد کا پتہ چلتا ہے اور پشتونوں کے مزاج اور طرز زندگی
کے بارے میں کافی حوالے ملتے ہیں۔ اس دور کے ادب پر نہ صرف فارسی اور عربی کے اثرات ہیں بلکہ
اس عصر کے لکھنے والوں نے براہ راست عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں لکھا ہے۔

اس دور کا سب سے اہم مسئلہ پیر روشن اور اخون درویزہ کا مذہبی عقیدہ، سیاسی اور ادبی
اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی نوعیت مذہبی ہو، ادبی ہو یا سیاسی لیکن ایک بات واضح ہے کہ اس اختلاف
نے پشتو ادب کو بیش بہا سرمائے سے مالا مال کیا۔ پیر روشن اور اخون درویزہ دونوں کی یہ مجبوری تھی کہ
انھوں نے اپنے نظریات تحریری اور تقریری دونوں ذرائع سے پشتو زبان میں دوسروں تک پہنچائے اس
لئے کہ وہ مخاطب پشتونوں سے تھے۔ اس طرح پشتو کے تحریری سرمایہ میں ارادی یا غیر ارادی طور پر اضافہ
ہوتا گیا اور پشتو کی کلاسیکی نظم و نثر کی بنیاد مضبوط ہوتی گئی۔

اس اختلاف میں کچھ لوگ پیر روشن کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور کچھ اخون درویزہ کو اس میں کوئی
شک نہیں کہ دونوں بہت بڑے عالم اور دانشور تھے لیکن علم و دانش میں پیر روشن کا پلڑا بھاری تھا اور اخون
درویزہ کے کچھ مذہبی اور عقیدی الزامات بھی پیر روشن کی کتاب خیر البیان میں دستیاب ہونے کے بعد
درست ثابت نہیں ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اخون درویزہ شریعت کا زیادہ پابند
تھا اور پیر روشن متصوفانہ فلسفیانہ موشگافیوں میں بات کرتا تھا۔ پیر روشن کے مذہبی اور صوفیانہ عقائد پر
اخون درویزہ کے علاوہ اور علماء نے بھی اعتراضات کیے ہیں۔ خوشحال خان خٹک نے پیر روشن اور اخون
درویزہ دونوں کی کتابوں خیر البیان اور مخزن کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس اختلاف سے پشتو
ادب میں وہ اضافہ ہوا ہے جو بہت کم ادوار میں ہوا ہوگا (۵)

پشتو میں کلاسیکی روایت کو بام عروج تک پہنچانے کا وظیفہ خوشحال خان خٹک اور ان کے
جانشینوں نے سرانجام دیا جس میں رحمان بابا، عبدالحمید مومند، معز اللہ خان، محمد علی خان اور کاظم خان شیدا
کا بھرپور حصہ ہے یہ پشتو ادب کا تیسرا دور کہلاتا ہے۔ اس کا تیسرے دور میں مذکورہ شعراء کے علاوہ

خوشحال خان خٹک کی اولاد کے ساتھ ساتھ یونس، سکندر آفریدی، مہدی صاحبزادہ، احمد شاہ اولیلی، پیر محمد کاکڑ، حافظ الپوری، قیمتی علی خان، مرزا حنان بارکزئی، مصری خان گگیانی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ اسی طرح خواتین شاعرات میں زرغونہ، میرمن رابعہ، میرمن نیک بختہ، نوتیا خٹک اور حلیمہ خٹک کے نام بھی سامنے آتے ہیں۔ پشتو ادب کے اس تیسرے دور میں نظم کی کئی اقسام و اصناف جیسے مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعی، قصیدہ، مرثیہ، حمد و نعت اور مناقب بھی پشتو کے تحریری سرمایہ کا حصہ بنیں۔

پشتو کے اس کلاسیکی دور کا اختتام بارھویں صدی ہجری کے آخر تک ہو جاتا ہے اور یہیں سے پشتو کے عوامی ادب کا باقاعدہ آغاز پشتو ٹپے کے استثنا کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں عوامی ادب یا پشتو فوک لور کے بارے میں تحقیق کا آغاز بھی ہو جاتا ہے اور تخلیقی میدان میں بھی عوامی ادب کے بہترین نمونے منصۂ شہود پر آ جاتے ہیں۔ اس دور میں ان گنت رومانوی داستانیں عوامی صنف مثنوی کی حیثیت میں احاطۂ تحریر میں آ جاتی ہیں اور عوامی ادب کی دیگر اصناف میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو رومانوی داستانیں اس دور میں لکھی گئی ہیں ان میں زیادہ مشہور داستانوں کی فہرست درج ذیل ہے:

1۔ آدم خان درخانئی۔ صدر خان خٹک
2۔ آدم خان درخانئی۔ سید بوجل شاہ
3۔ قصہ ابراہیم۔ ملا احمد جان
4۔ مومن خان شیرینئی۔ جمشید
5۔ اختر منیر شہزادہ۔ ملا نعمت اللہ
6۔ اختر منیر شہزادہ۔ بوجل شاہ
7۔ آزاد بخت بادشاہ۔ فرید خان
8۔ الف لیلیٰ۔ ملا نعمت اللہ
9۔ الہ دین چراغ۔ ولی محمد
10۔ امیر حاتم۔ جمال
11۔ امیر حمزہ۔ ملا احمد جان
12۔ قصہ ایمان مجموعہ۔ علی حیدر
13۔ قصہ بختیار۔ بوجل شاہ
14۔ بہادر بوخلہ۔ عبدالوہاب ذکی
15۔ بہادر و معشوقہ۔ ولی محمد
16۔ بہرام شہزادہ و گل اندام۔ ملا نعمت اللہ
17۔ بہرام شہزادہ و گل اندام۔ عبدالحکیم
18۔ دیر بابا گگیا او قدرئی۔ جمشید
19۔ تجمہ۔ احمد خلیل
20۔ جہاندار شاہ۔ احمدی صاحبزادہ
21۔ چمنی خان۔ عبدالوہاب ذکی
22۔ حاتم طائی۔ ملا نعمت اللہ

23۔ دریونگا او - ولی محمد
24۔ داستان عشق - جمشید
25۔ رستم و سہراب - ملا نعمت اللہ
26۔ ونجی سلطان - نور محمد
27۔ سبز پری زرہ پری - دلیر خان
28۔ تور دے لے او قسمی - صمد خان
29۔ سسی پنون - منظور خان
30۔ سردار خان شاہ صنم - سید اکبر صابر
31۔ سوانی بھنبھوال - ملا نعمت اللہ
32۔ شاہ گدا - عبدالحمید بابا
32۔ سیف الملوک - نور محمد
33۔ شمشاد - ملا مستقیم
34۔ شہزادہ اورنگ - نور محمد
35۔ قصہ شہزادہ بدر منیر - ملا احمد
36۔ قصہ شہزادہ اورنگ - نور محمد
37۔ قصہ شہزادہ بدر منیر - ملا محمد
38۔ شہزادہ ودا و شہزادگی زیبا - ملا نعمت اللہ
39۔ شہزادہ وزیر او شہزادگی خاتون - عبدالوہاب دقی
40۔ شہزادہ سلیم او لال پری - ولی محمد طالب
41۔ شیر عالم میمونئی - امیر غلام صادق
42۔ شیر عالم میمونئی - جمال
43۔ شیرین فرہاد - ملا نعمت اللہ
44۔ شیرین فرہاد - ولی محمد
45۔ طالب جان - ولی محمد
46۔ ظریف خان - ملا نعمت اللہ
47۔ ظریف خان - نور محمد
48۔ عجب خان - جمشید
49۔ گل او قاضی - احمد
50۔ عجبہ جنئی - ولی محمد
51۔ فتح خان قندہاری - ملا نعمت اللہ
52۔ فرید خان - قاضی عبدالرحمان
53۔ جان عالم - قاضی عبدالرحمان
54۔ فسانہ غم آلود - امان اخون
55۔ گل بکاؤلی - ملا نعمت اللہ
56۔ گل صنوبر - امان اخون
57۔ گلبہت شہزادگے - فاضل شاہ
58۔ گلبہت شہزادگے - روئیل خان روئیل
59۔ لیلیٰ مجنون - ملا نعمت اللہ
60۔ لیلیٰ مجنون - عبدالوہاب دقی
61۔ محبوبا جلات - عبدالکریم
62۔ محبوبا جلات - امان
63۔ موسیٰ خان گل مکئی - ملا نعمت اللہ
64۔ مومن خان شیرنئی - ولی محمد
65۔ مومن خان شیرنئی - سید اکبر صابر
66۔ نیک اختر - نور محمد
67۔ نیوا تمبولا - ملا نعمت اللہ

68۔ ورق شہزادہ۔ ملا عبدالکریم
69۔ نیرنگ عشق۔ ترجمہ حمید بابا
70۔ جشت بہشت۔ ملا الفت اللہ
71۔ یک یوسف۔ علی حیدر جوشی
72۔ دیوان بادشہ۔ نور محمد
73۔ دوہ جوڑی۔ احمد جان
74۔ قصہ عجیب الحکایات۔ احمد جان
75۔ قصہ امداد خان۔ علی حیدر جوشی
76۔ وشیر علی، بیمو خان۔ امیر غلام صادق
77۔ شیر عالم میمونئ۔ ولی محمد
78۔ دوہ گلونہ۔ تاج محمد
79۔ دوصال شپہ۔ جمشید
80۔ دنظر۔ محمد صادق شاکر
81۔ فرید جان او بی بی نور جہانہ۔ خان زلی خان
82۔ بہزاد او شہزادہ۔ سید یعقوب علی شاہ
83۔ پاک بھارت جنگ عبدالواحد ٹھیکیدار
84۔ دین بابا او خوبی پہ۔ زخمی جگر
85۔ دخوئیداد خان مار پاگے۔ شمس الدین مسکین
86۔ دل افزا شہزادہ۔ امان
87۔ فتح خان او کرے۔ فدا مطہر
88۔ دیجوری۔ صاحبزادہ
89۔ درشید بادشہ شام۔ اکمل لیوے
90۔ دوخلہ۔ سید راج پادل
91۔ داہا بچہ او ہم۔ عبدالشاہد
92۔ شہزادہ گلشن او بی بی بارون۔ مؤلف عبدالغفار
93۔ سیف الملوک او بدری جمالہ۔ محمد نور (۱)

اس دور میں ضرب الامثال اور ٹپوں کے بارے میں بھی اچھی خاصی تحقیق ہوئی اور کئی کتب مرتب ہوئیں اس سلسلے میں پاکستان کے علاوہ افغانستان میں بھی کئی کتابیں مرتب ہوئیں۔ خصوصی طور پر ضرب الامثال اور ٹپوں پر مشتمل کتابوں کی تفصیل پیش نظر ہے۔

1 پښتو متلونه وزرمېنې مجموعه محمد قدیر تره کئی او امین الله۔ زمریالی 1318 ش- پښتو ټولنه کابل- 231متلونه۔
2 پښتو متلونه- درنمه مجموعه محمد گل نوری پښتو ټولنه کابل- 1327 ه ش - 1900 متلونه۔
3 پښتو متلونه- دپښتو خبرو نو بین الملکی مرکز- کابل 1358 ه ش
4 دکانڅري کربنې سید نوار گوهر کپوره مردان - جنوری 1961ء۔
5 دمتلو نو قصے (د ملغلرو امیل) ولی محمد ولی - پشتو اکیڈمی کوئٹه
6 Bannu-on our Afghan Frontier. S.S. Tharborn 1876 AD

7 سپېڅلي ګانړه. ولي محمد سيال کاکړ 1969 ، پښتو اکيډمي کوټه. 1075 متلونه .

8 متلونه. کرنل سي لې باڼل (د پښتو متلونه) اله آباد 1934 ء.

9 روضي الامثال. پادري هيور.

10 هارو بدار، نار مسټريټر.

11 پښتو ګرامر. ميجر راورټي.

12 پشاور ډسټرکټ ګزيټيئر 1930 ء.

13 پښتو نکلونه. سيال کاکړ پښتو اکيډمي کوټه. مارچ 1979 ء.

14 مجموعه . مولانه عبدالرحيم. اوائل 20 صدی عيسوی.

15 مجموعه . قاضي رحيم الله . اوائل 20 صدی عيسوی.

16 مخ په آوينه کېنږې. حاجي حميد ګل آفريدی .

17 دپښتو آهنګونه (ناچاپ).

18 دمتلونه مجموعه . محمد دين رواک 1344 ء.

19 امثال او حکم. عنائت الله شيراني 1354 ه ش. پښتو ټولنه کابل.

20 پښتانه . مياں خان ابريدے .1350 ش. پښتو ټولنه کابل .

21 ادبيات مردم . محمد دين وجدان . پښتو ټولنه کابل (پښتو پرخه لړی).

22 ملی ادب. سيال کاکړ. سټمبر 1972 ، 48 متلونه .

23 زمونږ ثقافتي پنګه. مضمون اولس مجله کوټه . فاروق شاه سمالزی. اکټوبر ، نومبر 1963 ، 28 متلونه .

24 طلب مذهب. عبدالسلام اڅکزني. 1356 ش 48 متلونه .

25 دمتلو تر قيصي. اول ټوک اوب الخير حلانه. پښتو اکيډمي کوټه. اکتوبر 1975 ، 114 متلونه .

26 پښتو متلونه . شير محمد کريمي. ترجمه دتهارين 1214 ،

متلونه پښتو ټولنه کابل 1360 ش۔

27 روهي متلونه ۔ محمد نواز طائر. پښتو اکیډمي پشور پښتو اردو، انګریزي۔

28 دپښتو متلونو مجموعه. لیبدیف ، میرمن لود دمیلایا خروویچ ماسکو 1961 ء۔

29 دپښتو متلو نو او محاورو مجموعه 1950 ، تاشقندروس. ویکو سکی ګار یلینی چوکیوف۔

30 دپښتو ایډیم انو ډکشنری 1932 ، ګیل بیرټ سون میر فورټ۔

31 دپښتو متلونو او محاورو ژبه انو نظم. سولت شاه 1932 ء۔

32 پی ایچ ډی تهیسز. میر ګانوف. ماسکو 1983، 4000 متلونه۔

33 اولسي ملغرلې. د پښتو متلونو او اولسي قيصو مجموعه ۔ سيد اګل غريبيار ۔ دخپرو دبيار غوني اداره پيښور۔

34 دمتلو نو قيصې ۔ موسى خان شنواري ۔ دوه جلده اوبنايو خانى (جنوري 1997) اول مئى 1990، (دوم 1995 ،) جولائى۔

35 دکانړي کرښې. متلونه ۔ نور محمد نور زرمتي. جنوري 2001 ، 8000 متلونه ۔

36 د متلونو ټالنبي کيجر محمد نواز خان ريټائرډ. يونيورسټي بک ايجنسي 2001 ۔

37 تاريخي متلونه ۔ ميجر محمد نواز خان ريټائرډ. يونيورسټي بک ايجنسي پشاور 2004 ء۔

38 دمتلونو سوغات ۔ ميجر محمد خان ريټائرډ (ناچاپ)۔

39 دمتلونو ګلدسته ۔ ميجر محمد نواز خان ريټائرډ (ناچاپ)۔

40 رنګ رنګ متلونه ۔ ميجر محمد نواز خان ريټائرډ (ناچاپ)۔

41 متلونه ۔ مجموعه ماسټر شاکر محمد صيب (مرحوم) شهباز

کرمی مردان 500۔

42. دپشتو متلونه اور محاورے ۔ میجر ریٹائرڈ محمد نواز خان (مسودہ 17 جولائی 1958ء تا جون 1962ء 720 متلونه)۔

43. روهی متلونه ۔ پروفیسر محمد نواز طائر ۔ پشتو اکیڈمی پېښور، جلد اول 1957 ۔

44. روهی متلونه ۔ پروفیسر محمد نواز طاہر ۔ پشتو اکیڈمی پېښور، جلداول 1957 ۔

45. متلونه په سوات کښې ۔ اختر ملک اختر ۔ سوات 1995ء۔

46. پښه ئي پښتو متلونه محمد زمان کلیمانی۔ دپښتو خیر تیزېنې المللی مرکز کابل 1364 ش/ 1985ء۔

47. د پښتو متلونه ۔ پښتو ټولنه کابل ۔ مهتمم محمد دین ژواک (حفیظ الله خان) کابل 1344 ش۔

48. تاریخ خټک۔ اردو۔ محمد سرفراز خان خټک عقاب ۔ بنوں۔

49. دژونداو د حکمت خبری(اسلامی لا بتونی) پسلو متلونه 1291ء اودنورو پو طانو و بداوی) کمال شنواری ۔ دسمبر 1999ء۔

50. رستنی سپېڅی ملغلرې۔ پروفیسر ڈاکٹر گل جانان ظریف پېښور 1994ء۔

51. فولک لوری ملغلرے۔ عبد الکریم پټنک (دمتلونو محاورو قیصی) پښتو ټولنې کابل 1356 ش۔

52. پښتو متلونه عبد الروف بېنوا (پښتو) انګریزی ترجمه ع شنواری کابل 1358 ش۔

53. متلونه ارلنډئی۔ یاذخیری الغات پښتو ټولونکی محمد عمر قلمی نسخه آرکایوز کابل۔

54. تو ھمات ۔ محمد موسی خان شنواری ۔ پېښور، جون 1999ء

(محاورے، متلونه، تپے)۔

55 Pukhto Proverbs. Translated by Akbar S. Ahmed Preface by Sir Olaf Carro Oxford University Press-Karachi-1975

56 دمتلونو استانونه، ابو الخیر حلاند۔

57 میرا خدو خیل شیرین زاده خدو خیل۔ جون 2000ء (دخدو خیلو متلونه)۔

58 هوښیاران وائی۔ متلونه۔ محمد سرور خټک (خرکوی ملاکنډ) حال رسالپوز سانین منډی رحمن گل پبلشرز جنگی محله قصه خوانی پشاور 2002ء۔

59 اولسی پانګه (متلونه او اصطلاحات) مولوی عبد الشکور یاسینی 1382ء ش پیښور۔

60 انګریزی پښتو متلونه Azeem Collection of English Pashto Proverbs استقلال بکس کوئٹه 2004ء۔

پشتو کی کتابیں

1 پښتو لنډئی۔ سلیمان لائق او مجاور احمد مومند۔ دافغانستان دعلومو اکیډمی دژبو او ادبیاتو مرکز، پښتو ټولنه 1363ء۔

2 روحی سندرے۔ اول جلد۔ سلمی شاهین۔ پښتو اکیډمی پېښور 1984ء۔

3 روحی سندرے۔ دریم جلد۔ سلمی شاهین۔ پښتو اکیډمی پېښور 1994ء۔

4 ټپه او ژوند۔ پروفیسر محمد نواز طاهر۔ پشتو اکیډمی پښتو 1980ء۔

5. روحي ادب (د پښتو ادبياتو تاريخ) محمد نواز طائر . پښتو اکيډمي پېښور 1986 ء طبع دويم ـ
6. ارماني ټپې ـ شاکر الله شاکر . بت سيرے ، مردان ـ
7. دمر چمن گلونه ـ الموسوم په ټپې ـ شير علي درياب 1985 ء ـ
8. نوے ټپې ، دلاور سيلاب 1985 ، زيب آرت پبلشرز پېښور ـ
9. سوے ټپې ـ شاکر الله شاکر ـ بت سيرے مردان ـ
10. ټپې ـ يا قربان سيد اکبر صابر . نوبهار 1969 ء ـ
11. سپورمېږه کږنک وسه راخژه ـ جيمز اينډ الدسن ـ پېښور ـ
12. دپښتو نخواه دشعر هارو بهار ـ دار مستشر بلهر ـ
13. پښتو ټپه ـ پروفيسر محمد داور خان داؤد ـ
14. دټپو معاشي تجزيه (مقاله) پروفيسر محمد نواز طائر ـ
15. اباسين (مقاله) محمد پرويش شاهين ـ
16. نادرے ټپې ـ فضل احسان احسان 1997 ء ـ
17. فرمائشي ټپې ـ زيب آرټ پبلشرز پېښور ـ
18. دسوي زړه فرياد ـ زيب آرټ پبلشرز پېښور ـ
19. ترمے او بنگړے ټپې ـ زيب آرټ پبلشرز پېښور ـ لياقت خان لياقت ، اگست 1989 ء (1107) ـ
20. ټپې ـ زيب آرټ پبلشرز پېښور ـ
21. عقل تمام دټپو مجموعه ـ جمال مومند سنگر ـ حاجي فضل احمد اينډ سنز پېښور ـ
22. پېښورني ټپې ـ ولي محمد چغرمټي ـ نوراني کتب خانه پېښور 1860 ټپې ـ
23. مصرعے په وينو سرے (ټپې) فريدون زاهد ـ مړ ديگرام سوات 1984 ء ـ

24 سرود کوهسار. ټپې (اردو ترجمه) محمد یونس سیټهي۔

25 لنډئ. غرتیې خانوړے (دټپو مجموعه)۔

26 یکه زار ټپې. محمد اقبال حیران عمرزئی.
زیب آرټ پبلشرز اپریل 2000ء۔

27 لنډئ سید اګل غریب یار. پښتور. دختیځ دیدار غوني اداره۔

28 دنړے زمانے ټپې. میجر محمد نواز خان ریټائرډ 2001ء۔

29 دعشقیه داستانو ټپې. میجر محمد نواز خان ریټائرډ. ناچاپ

30 تاریخي ټپې. میجر محمد نواز خان ریټائرډ.
یونیورسټي بک ایجنسي پشاور 2004ء۔

31 دټپو خزانه. میجر محمد نواز خان ریټائرډ. ناچاپ۔

32 رنګ رنګ ټپې. میجر محمد نواز خان ریټائرډ. ناچاپ۔

33 ټپې قلمي مسوده. خان عبد الولي خان1981ء۔

34 ټپې قلمي مسوده. پروفیسر عبد الرئوف نوشهروي۔

35 ټپې قلمي مسوده. ډاکټر خیال بخاري۔

36 لنډئ. پوهاند عبد الروف بینوا کابل. پښتو ټولنه 1337 ش۔

37 دګلوتال. سید اکبر صابر. نوښار۔

38 ګل ټپې. ګل محمد کاکړ دوه جلده. پښتو اکیډمي کوټه۔

39 ټپې او دشعور رود. مجاهد ادریس صاحبزاده. پښتو اکیډمي
پیښور 1977ء۔

40 پښتنۍ سندرے. پوهاند ګل باچا الفت دوه جلده. پښتو ټولنه
کابل 1334 ش۔

41 دپښتو ټپې معاشرتي او ثقافتي اثر. سلمی شاهین. پښتو
اکیډمي پیښور 9-1988ء۔

42 مشهور ټپې. نوراني کتب خانه. پیښور

43 لنډوې . انتخاب پښتو . دری عبد الروف بینوا . انګریزی سعد الدین شپون کابل 1358 ء ـ

44 دلنډیو کتاب ، جمال اثر . پیښور 1800 ټپې ـ

45 بیلات ګل محمد کاکړ پیښتو اکیډمی کوئټه ـ

46 بهار ګلشن ـ

47 کرنی ادب ـ

48 نن پرون . رساله دهلی ـ

49 ژوند . رساله دهلی ـ

50 بهار نوروزی . د 1947 ء نه وراندے ـ

51 متلونه اولنډئی . یادری خیر الغت پښتو . تولونکی . محمد عمر . قلمی نسخه . آرکایوز . کابل ـ

52 غوز شکه دلنډیو . پائنده محمد نمیر . قلمی نسخه ـ

53 دنوری ملی سندری . پښتو تولنه . کابل چهاپ ـ

54 دمینی جهان یا ملی موسیقی . داستان تولونه . قلمی اول جلد ـ

55 دمینی جهان . دویم جلد . پښتو تولنه . کابل ـ

56 دمینی جهان . دریم جلد . پښتو تولنه . کابل ـ

57 دمینی جهان . خلورم جلد . پښتو تولنه . کابل ـ

58 مشهوری ټپے . سلیم . پیښور . چهاپ ـ

59 دیوان د سید غلام تنګر عاری . قلمی نسخه . آرکایو زافغانستان ـ

60 دحسین دیوان . پیښور چهاپ ـ

61 فوکلوری ګیډئی . علی محمد منګل . پښتو تولنه کابل . چهاپ

62 غرنی سندرے . غروال . پښتو تولنه . کابل چهاپ ـ

63 دخلتو سندری . حبیب الله رفیع . پښتو تولنه . کابل ـ

64 دزړه قطری . عبد الله جان اسیر . پیښور چهاپ ـ

65 دغم سری فریادونه ـ ټپې ـ علي اکبر صابر ،1994 ،(2200) ټپې زیب آرټ پبلشرز ـ پېښور ـ

66 تومات ـ محمد موسی خان شنواری ـ پېښور ـ جون1999 ء

(محاورے ـ ضرب المثل ـ ٹپے)

67 رنګینې ټپې. انتخاب دلنډۍ (غوټنۍ خاورې) فرهاد محمد غالب ترین. خویشکی کلے. او محمد اقبال خیر ان. عمرزئی کلے. زیب آرټ پبلشرز پېښور . اپریل 2002 ء۔

68 فرمانشي ټپې ـ فدا محمد کدیوال. ضلع مردان اؤ محمد انور سوناتي مانکني صوابي ـ زیب آرټ پبلشرز پېښور

69 ننني لنډۍ ـ محمد اجان غلجني ـ پېښور ـ جولائي 2002 ء ـ صد ناګزاره کلونو ټپې۔

70 دور کو لا رو مسافر ـ میاں شفاعت علي شناعت ـ کانګړه ـ چار سده 1995 ، (31 ټپې پکښې شامل دي) ۔

71 ټپه ایزه النامه (حواله داور خان داود. پښتو مجله نومبر دسمبر 2002، صفحه 156)۔

72 جهادي پښتونې (جهادي لنډۍ یا ټپې) مولوی عبد الشکور باسیني 1382ش پېښور ۔(7)

پشتو عوامی ادب کی جن دیگر اصناف میں تخلیقی اور تحقیقی کام ہوا ہے ان میں لوک گیت، سالند ے، الاطی، سروکی، چراکی، ٹپہ ے، چارت، لوبے، نیمکئی اور چند دیگر علاقائی اصناف شامل ہیں ۔عوامی شعراء میں سے جنہوں نے زیادہ کام کیا ان میں ملا نعمت اللہ، ملا احمد جان، سید بابلی شاہ اور گل احمد کے نام سرفہرست ہیں۔

جس دور میں پشتو میں عوامی ادب پروان چڑھ رہا تھا اسی دور میں پشتو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے مستشرقین کی خدمات بھی سامنے آ رہی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جس میں پشتو زبان وادب

میں باقاعدہ تحقیق اور تنقید نے رواج پایا۔ مستشرقین کون لوگ ہیں اور انہوں نے کیا علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، ثقافتی، لسانی اور دیگر خدمات سرانجام دیں اس کا تذکرہ مختصر طور پر یوں کیا جاسکتا ہے۔

مستشرقین (Orientalists) کی اصطلاح ان محققین اور دانشوروں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف آئے اور مشرقی زبانوں، ادب، مذاہب، ثقافت، اقدار، تاریخ اور دیگر موضوعات پر بھی کام کیا اور مختلف اوقات میں اپنی تحقیقات پیش کیں۔ ان کی تحقیقات اور علمی خدمات کے عوامل کئی ہوسکتے ہیں لیکن بنیادی محرکات میں سے مندرجہ ذیل زیادہ واضح اور اہم ہیں۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد چونکہ برصغیر پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی اور انگریز برصغیر میں حکمرانی ہی کے لئے آئے تھے لہٰذا برصغیر میں سیاسی حلقوں نے آخرکار انگریز حکمرانوں کے خلاف اپنا ردعمل دکھانا شروع کیا۔ خصوصاً ان اقوام نے جو مضبوط تہذیبی اقدار کی حامل تھیں، منظم تحریکوں کا آغاز کیا۔ کیونکہ ان کو محسوس ہونے لگا تھا کہ انگریز سامراج کی موجودگی میں ان کی تہذیبی اقدار، لسانی شناخت، عقائد و رسوم اور انفرادی طرز زندگی کا تحفظ مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے انگریز سامراج کے خلاف پورے ہندوپاک میں مختلف قسم کی تحریکیں شروع کیں۔ اس کے ردعمل میں انگریزوں نے دیگر محاذوں پر اپنا اثر دکھانے کے ساتھ ساتھ ایک کام یہ کیا کہ ان اقوام کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ ان کی طرز زندگی، رسوم و اقدار، زبان و ادب اور تہذیبی عوامل کو کوئی نقصان نہیں دیں گے بلکہ ان کے تحفظ کی کوشش کریں گے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے یہاں کے لوگوں اُن کی زبانوں اور ملی اقدار و عوامل پر تحقیقات شروع کیں۔ یہاں کی زبانیں سیکھیں اور پھر ہر میدان میں بنیادی کام کیا۔

انگریزوں کا ایک یہ مقصد بھی تھا کہ اپنے اقدار، عقائد اور رسوم سے برصغیر کے لوگوں کو آگاہ کر سکیں لہٰذا انہوں نے اس سلسلے میں اپنی زبانوں کے ترجمے یہاں کی زبانوں میں کیے اور یہاں کی زبانوں میں دستیاب علمی و ادبی ذخیرے کو اپنی زبانوں میں شامل کیا۔

مغربی دانشور مشرق کے لوگوں سے علمی و ادبی لحاظ سے کافی آگے تھے لہٰذا ان کے علمی تجربہ اور تجسس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ مشرقی اقدار کو جاننے کی کوشش کریں اور تحقیقی کام کریں۔

مغربی لکھنے والے فطری طور پر معروضی اور سائنٹیفک اپروچ کے حامی ہوتے ہیں لہٰذا عموماً انہوں نے حقائق کو اصلی اور معروضی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی اور اپنی تحقیقات پیش کیں۔

مشرق کی سرزمین اور علمی و ادبی لحاظ سے شاندار روایات اور تاریخی عوامل کی اہمیت اور کشش نے بھی مغربی دانشوروں کو تحقیق و تدوین کے لئے آمادہ کیا اور انہوں نے ضروری سمجھا کہ یہاں کے علمی و ادبی خزانوں کی تلاش کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں۔

ان محرکات و عوامل کے علاوہ بھی کئی عوامل ہو سکتے ہیں جن موضوعات پر مستشرقین نے کام کیا ہے وہ بھی متفرق ہیں لیکن یہاں چند بنیادی موضوعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔	لغت سازی	۲۔	گرامر
۳۔	پشتونوں کی اصل نسل	۴۔	پشتو زبان کی بنیاد، پیچ اور دیگر لسانی عوامل
۵۔	تراجم	۶۔	پشتو کے قدیم ادب کے متفرق پہلو
۷۔	قدیم شعراء کے تذکرے	۸۔	پشتو، پشتونوں اور پشتو ادب کی تاریخ
۹۔	لوک ادب (فوک لور)	۱۰۔	مذہبی ادب

۱۱۔ دیگر متفرق موضوعات

چونکہ ان مستشرقین کا کام بنیادی اور ابتدائی ہے اس وجہ سے کئی مواقعوں پر ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں اور ان کے کام میں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اس سے ان کے کام کی اہمیت کم نہیں ہوتی کیونکہ پشتو میں باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہی انہوں نے کیا ہے ان کی خامیوں پر کئی دانشوروں نے بعد میں تنقید بھی کی ہے اور غلطیوں اور خامیوں کی تصحیح اور تکمیل کی کوشش کی ہے جیسے دوست محمد جاہل مرحوم کی کتاب On a Foriegn Approach to Khushal جس میں انہوں نے خوشحال خان خٹک پر مستشرقین کی خامیوں اور غلطیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اس طرح کئی پشتون دانشوروں نے مختلف مواقع پر موضوع کے مطابق بحث و تبصرہ کیا ہے۔ ان مستشرقین نے جن موضوعات پر اور جس معیار کا بھی کام کیا ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ ہند و پاک کی تمام بڑی زبانوں کے ساتھ پشتو زبان و ادب میں بھی تحقیق اور علمی طرز فکر کی بنیاد انہوں نے رکھی ہے(۸)

ان مستشرقین میں زیادہ نمایاں نام یہ ہیں۔ میجر راورٹی، کپتان وان، ہنری والٹر بلیو، پروفیسر برنارڈ ڈورن، ڈاکٹر ٹرمپ، ارنسٹ ٹرمپ، پادری ہیوز، جارج مارگن سٹارن، ڈاکٹر میکنزی، سر اولف کیرو، گریرسن، ہربرٹ بلزل، جے ڈبلیو سپین، جنرل انولڈ، رابرٹ سمپسن اور چند دیگر اس دور میں

مستشرقین کے علاوہ، پشتون ادبا بھی نظم ونثر میں لکھتے رہے، یہاں تک کہ تخلیقی کاوشوں کے ساتھ ساتھ، تحقیقی، تاریخی اور تنقیدی موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ اس دور کو پشتو ادب جدید دور سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جس نے بعد میں بیسویں صدی کی جدید اصناف کیلئے راستے ہموار کیے۔ اگرچہ اس دور میں مولوی احمد، منشی احمد جان، میر احمد شاہ رضوانی اور احمد تیراہی نے بہت زیادہ کام کیا، مگر ان کے علاوہ بھی کئی لکھاریوں نے پشتو ادب کو مختلف جہات سے قیمتی موتیوں سے مالا مال کر دیا۔ شاعری کے علاوہ اس دور میں جدید نثری ادب نے خوب ترقی کی اور جدید ترین نثری اصناف کے لئے راستے کھول دیے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر کے حالات شعر و ادب میں جدت پیدا کرنے میں اتنے کارگر ثابت ہوئے کہ پورے ہندوستان میں لکھنے والوں نے کروٹ لی۔ یہ حقیقت تو واضح ہے کہ معاشرہ کبھی بھی جامد اور ایک ہی قسم کے حالات سے ہمیشہ دوچار نہیں رہتا۔ حالات بدلتے رہتے ہیں، سماجی منظرنامہ بدلتا ہے، ادب چونکہ سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے لہذا معاشرتی تبدیلیوں اور سماجی منظرنامے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب اور عصری تقاضوں میں بھی تحرک اور تبدیلی آجاتی ہے۔ یہی تحرک اور تبدیلی ادب میں جدت کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔

چونکہ 1857ء کے بعد برصغیر پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی لہذا ہندوستان کی ان قومیتوں نے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنا شروع کیا جو ہزاروں سال قدیم اقدار کی حامل تھیں۔ برصغیر میں بنگالی، سندھی، بلوچ وغیرہ ایسی قومیتیں تھیں جو اپنی مخصوص روایات اور اقدار رکھتی تھیں۔ اسی طرح پشتونوں کے طرز زندگی، ملی اقدار، لوک ورثہ، ثقافتی شناخت، لسانی اور ادبی پس منظر کو بھی ہزاروں سال کی پشت پناہی حاصل تھی۔ لہذا جب ان قومیتوں اور خصوصی طور پر پشتونوں نے اپنی روایات، اقدار، ثقافت، زبانوں اور ادب کو انگریزوں کی موجودگی میں غیر محفوظ سمجھا تو ہر طرف سے مزاحمتی تحریکیں ابھریں۔ اپنی شناخت کے تحفظ اور اپنی آزادی کیلئے لوگوں نے جدوجہد شروع کی۔ انگریزوں نے ان قومیتوں کو یہ احساس دلانے اور باور کرانے کیلئے کہ وہ ان قومیتوں کے تحفظ کا ہر حال میں خیال رکھیں گے، ان کی زبانوں اور ادب پر جدید انداز میں لکھنا شروع کیا۔ یہاں سے پورے برصغیر اور خصوصی طور پر پشتو میں دو طرفہ ادبی جدت نمودار ہونے لگی۔ ایک طرف انگریزوں نے براہ راست پشتو زبان و ادب پر کام کرنا شروع کیا اور ساتھ ہی پشتون دانشوروں سے بھی کام کروانے لگے۔ دوسری طرف انگریزوں کی

مخالفت میں مزاحمتی ادب تخلیق ہونے لگا۔

ادب کے یہ دونوں زاویے جدید تھے اور ان ہی جدید زاویوں کے تناظر میں انگریزوں کی سرپرستی میں جدید نثر کے لئے راستہ ہموار ہوا اور انگریزوں کی مخالفت میں جدید مزاحمتی ادب بھی پروان چڑھا۔ اسی سلسلے میں جدید نثر کے بڑے لکھاری مولوی احمد، منشی احمد جان، میر احمد شاہ رضوانی، میاں عنوان الدین کاکاخیل اور چند دیگر پشتون لکھاری جدت کے ساتھ پشتو میں نکھرتے گئے(۹)

اس دور کی نثر نگاری کی چیدہ چیدہ خصوصیات کو ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پشتو کی جدید نثر کا راستہ اسی دور کی نثر نگاری نے صاف کیا۔ خصوصاً منشی احمد جان کی نثر کافی حد تک جدت کی حامل تھی۔

۲۔ اس دور میں نثر تکلف، قوافی اور ترصیع کاری سے آزاد ہوئی۔ جملے مختصر، زبان سلیس اور تحریر میں تخلیقی قوت کا مظاہرہ ہونے لگا۔

۳۔ اس دور میں اگرچہ مذہبی و اصلاحی مسائل پر لکھا جانے لگا تھا لیکن زیادہ فلسفیانہ موشگافیوں، صوفیانہ نظریات اور پیچیدہ قسم کے جملوں سے کافی حد تک احتراز کیا جانے لگا۔

۴۔ لغت نگاری کا سلسلہ جو اس دور سے پہلے بھی جاری و ساری تھا اس دور میں بھی جاری رہا اور اس سلسلے میں جدید طرز فکر کو اپنا کر علمی اضافے ہونے لگے۔

۵۔ اس دور میں نثری داستانیں اس انداز سے لکھی جانے لگی کہ آئندہ دور کے لئے جدید فکشن، ڈرامہ، ناول اور افسانہ کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

۶۔ اس دور میں ڈپٹی نذیر احمد کے دو ناولوں کے تراجم نے جدید فکشن تخلیق ہونے کے لئے اور بھی تحریک دی اور بعد میں فکشن کے میدان میں بہت گراں قدر اضافے ہونے لگے۔

۷۔ اس دور میں پشتو فوک لور کو بھی نئے زاویوں میں دیکھا جانے لگا اور اسی تناظر میں ادب تخلیق ہونے لگا(۱۰)

پشتو کے اس چوتھے دور میں علم و ادب کے کئی گوشوں پر توجہ دی گئی جس میں ایک گوشہ لغت سازی کا بھی ہے۔ پشتو میں لغت سازی کا عمل زیادہ قدیم نہیں لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مشرقی زبانوں میں پشتو میں لغت سازی کا کام امتیازی اہمیت کا حامل اس لیے بھی ہے کہ یہ زبان ہند ایرانی خاندان سے متعلق ہو کر بھی بہت منفرد ہے لہذا اس کا ذخیرہ الفاظ بھی غیر معمولی توجہ کا حامل

ہے۔ مشرق کی قدیم ترین زبانوں سنسکرت اور ژند کے کافی الفاظ پر بھی پشتو کے اثرات موجود ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پشتو سنسکرت اور ژند میں مروجہ قدیم الفاظ کے مادہ پر اگر علم اشتقاق کی رو سے غور کیا جائے تو اولیت اور قدامت کے ساتھ ساتھ لفظی انفرادیت بھی شائد پشتو کے حصہ میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی زبانوں میں سب سے زیادہ ضروری پشتو میں لغت سازی کا عمل ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ایک بھی لغت ایسی نہیں مرتب ہو سکی جس میں الفاظ اشتقاق اور مادہ بھی علمی اصولوں کی بنا پر واضح کیا گیا ہو(۱۱)

اس دور میں مرتب شدہ لغات کے بارے میں، میں نے اپنی کتاب پشتو زبان و ادب کی تاریخ میں مجموعی تبصرہ ان الفاظ میں کیا تھا۔

پشتو زبان کا کلاسیکی ادب جتنا قدیم اور جس اعلیٰ معیار کا ہے اتنا لغت نگاری کا سلسلہ قدیم نہیں ہے۔ البتہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں گولڈن ٹیٹ کی لغت سے اس کی باقاعدہ ابتدا ہوتی ہے جو ابھی تک جاری ہے۔ اب تک مرتب شدہ لغات میں کافی تنوع ہے۔ ان میں براہ راست پشتو، پشتو لغات بھی ہیں اور پشتو اور پشتو اردو بھی، انگریزی پشتو بھی ہیں اور فارسی بھی، حتیٰ کہ جرمن، روسی اور چند دیگر زبانوں کے ساتھ پشتو کے لغات بھی مرتب کیے گئے ہیں۔ کئی لغات میں لغت سازی کے مروجہ اصول و قواعد سے انحراف بھی کیا گیا ہے اور چند ایسے بھی ہیں جو اصول قواعد کے مطابق ترتیب دیے گئے ہیں۔ چونکہ لغت سازی کا سلسلہ اٹھارویں صدی سے لے کر اب تک جاری ہے اس لئے ہم اس سلسلے کو جدید ادبی دور کا حصہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں اور پشتو ادب کے چوتھے دور سے شروع ہونے کی وجہ سے چوتھے ادبی دور کا حصہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ لغت سازی کے باوجود ایسی ایک بھی لغت اب تک مرتب نہ ہو سکی جس میں پشتو کے تمام بڑے لہجوں اور لسانیاتی جغرافیے کو مد نظر رکھا گیا ہو۔ اگرچہ ایک دو ایسی لغات مل سکتی ہیں جو مخصوص لہجوں کے الفاظ سے مرتب کی گئی ہوں جیسے لوریمر کی A Dictionary of Wazire Language وغیرہ لیکن یہ بھی محض ایک لہجے کا احاطہ کرتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پشتو زبان چونکہ لہجوں کی تقسیم کے حوالے سے انتہائی تنوع کی حامل ہے لہذا ایسی لغت بھی مرتب ہوں جن میں زیادہ لہجوں کی رنگ نمایاں ہو اور جو بیک وقت زیادہ لہجوں کی نمائندگی کرے(۱۲)۔

پشتو زبان و ادب کے لئے یہ چوتھا دور نہایت ہی خوش آئند رہا۔ اس دور میں تحقیق و تنقید کے

ساتھ تراجم کے میدان میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا اس میدان ادبی صحافت سرفہرست ہے۔ پشتو ادبی صحافت کی ابتداء سے لے کر قیام پاکستان تک ان گنت ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات منصۂ شہود پر آئے۔ سید احمد شہید کی تحریک المجاہدین سے وابستہ اردو اخبار "المجاہد" میں پشتو کے ایک صفحہ کی اشاعت سے پشتو صحافت کی ابتدا ہوئی جو آگے چل کر کئی ادبی رسائل و جرائد کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

1915ء سے 1935ء تک کے بیس سالہ صحافتی دور میں پشتو صحافت کی رفتار اگرچہ سست رہی لیکن اس دور میں چند نہایت ہی اہم پرچے بھی سامنے آئے۔ خصوصی طور پر خدائی خدمتگار تحریک کے خان عبدالغفار خان کا ماہنامہ پشتون نوجوان، بھارت سبھا کے کاکاجی صنوبر حسین مومند کا ہفت روزہ سیلاب اور امیر نوز جیبہ کا "انگار" وغیرہ اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ ان بیس سالہ صحافتی دور پر تبصرہ کرتے ہوئے اجمل خٹک لکھتے ہیں:

1915ء میں جب حاجی صاحب ترنگ زئی نے قبائلی علاقے میں اپنی جہادی تحریک کو منظم کیا تو انہوں نے ایک دستی لیتھو پریس بھی قائم کیا اور اس پریس کے ذریعے کئی پمفلٹ شائع کیے جس میں قبائلی عوام کو جہاد کی ترغیب دی گئی۔ یہ پمفلٹ قبائلی علاقے میں مفت تقسیم کیے جاتے تھے ان پمفلٹوں اور اشتہاروں کو بھی صحافت اور آزادی کی تحریک سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح 1923ء میں ثمرقند کے مجاہدین نے المجاہد کے نام سے ایک پرچہ نکالا۔ اس کے مدیر مولوی محمد بشیر تھے اور یہ قبائلی علاقے میں حکومت برطانیہ کے خلاف خبریں اور مواد شائع کرتا تھا۔ 1925ء میں حکیم آزادگل نے مردان سے ہفت روزہ افغان جاری کیا۔ اس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے یہ اخبار اردو، عربی، فارسی کے علاوہ پشتو مواد بھی شائع کرتا تھا۔ اس اخبار کے مالک و مدیر پٹھانوں کے مشہور قبیلے کاکاخیل سے تعلق رکھتے تھے اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ شروع میں اگرچہ ایسا کوئی اخبار یا رسالہ نہ تھا جو تمام مواد پشتو میں شائع کرتا تاہم بعض اردو اخبارات اور رسائل نے اردو کے ساتھ ساتھ پشتو میں کچھ حصہ شائع کر کے اپنے قارئین کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔ صوبہ سرحد کے پہلے قومی اخبار سرحد نے اس اہم طرف بھرپور توجہ کی اور اپنے پشتو حصے کی ادارت مولانا عبدالقادر مرحوم کے سپرد کی۔ مولانا عبدالقادر بعد میں پشتو اکادمی کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ پشتو صحافت میں ایک اور اہم پرچہ خان عبدالغفار خان کا ماہنامہ پختون بھی تھا۔ اس رسالے کا تفصیلی ذکر پہلے آچکا ہے۔ 1928ء میں جاری ہونے والے اس ماہنامہ "پختون" کو عبد الخالق خلیق مرتب کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا نام رسالے پر بحیثیت مدیر نہیں چھپتا تھا۔ اس کی اشاعت

باقاعدہ نہیں رہی شروع میں صرف آٹھ پرچے چھپتے تھے کہ اس کی اشاعت روک دینی پڑی۔ 1938ء میں اس کا دوبارہ اجراء ہوا۔ حسب معمول عبدالخالق خلیق اس کے مدیر تھے۔ پشتو کے لئے کچھ صفحات مرتب کرنے والے پرچوں میں صنوبر حسین کا "سیلاب" اور "انگار" شامل ہیں۔ انگار کا حصہ پشتو امیر نواز جلیا مرتب کرتے تھے۔ خان میر ہلالی نے 1933ء میں نوے پختون کے نام سے ایک پرچہ جاری کی۔ اسی طرح 1929ء میں ہمدرد افغان کا اجراء ہوا۔ 1935ء میں راحت زاخیلی نے "ستورے مشے" کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ شائع کرنا شروع کیا تاہم صرف تین شمارے نکلنے کے بعد یہ پرچہ بند ہو گیا(۱۳)

اس دور کے ادبی رسائل و جرائد اور چند اخبارات کا تذکرہ نامور محقق اور صحافی اجمل ملک نے اپنی کتاب "الصحافت صوبہ سرحد میں" میں کیا ہے اس کے علاوہ فارغ بخاری، کاکا جی صنوبر حسین سلطان محمد صابر اور کئی دیگر محققین نے پشتو کے ادبی صحافت کے بارے میں لکھا ہے۔ خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ:

اس دور کا اہم ترین ماہنامہ پشتون جو 1928ء میں اتمانزئی ہشت نگر صوبہ سرحد سے جاری ہوا تھا مختلف ادوار میں کئی قسم کے نشیب و فراز سے گزر کر بند اور جاری ہوتا رہا۔ ماہنامہ پشتو کی ادارت سے منسلک فضل معبود اس ماہنامے کے مختلف ادوار کے بارے میں عبدالخالق خلیق کی زبانی رقمطراز ہیں
"یہ مجلہ پہلی دفعہ 1928ء میں جاری ہوا۔ دو سال تک خادم محمد اکبر اس کا مدیر رہا۔ 1930ء میں خادم صاحب جیل گئے اور پھر طلیل ہو گئے۔ 1931ء میں قیدیوں کی رہائی کے بعد کراچی کے ایک جلسے میں جب میرا ایک ڈرامہ باچا خان نے دیکھا تو انہوں نے مجھے ماہنامہ پشتون کی ادارت کی دعوت دی جو میں نے قبول کی۔ پہلے دور کی ادارت 1928ء سے 1930ء تک خادم محمد اکبر نے کی دوسرے دور 1931ء سے دسمبر 1931ء تک کی ادارت عبدالخالق نے کی۔ اس دوران میں بھی جیل چلا گیا تو مجلہ بند ہو گیا۔ تیسرے دور 1938ء سے تین سال تک ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت تک عبدالخالق خلیق نے ادارت سنبھالی سردار اورنگزیب کی وزارت کے دور میں پرچہ ایک بار بند ہوا۔ چوتھے دور 1945ء سے 1947ء تک پھر عبدالخالق خلیق مدیر رہے۔

آخری ادوار میں یہ مجلہ میر مہدی شاہ مہدی کی زیر ادارت چھپتا رہا۔ کچھ عرصہ کے توقف کے بعد آج کل باچا خان مرکز سے شائع ہو رہا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے پشتو صحافت پر اجمل ملک یوں تبصرہ کرتے ہیں "ہفت روزہ "وطن"
محمد نواز خٹک نے پشاور سے شائع کیا مگر اس کا صرف ایک ہی شمارہ شائع ہوا تھا کہ دوسری عالمی جنگ
شروع ہوگئی۔ برصغیر میں ہنگامی حالات کا اعلان ہوا اور اسی کے باعث "وطن" بند ہوگیا "نن پرون" اور
"ژوند" سرکاری سرپرستی میں شائع ہوئے تاہم پشتو ادب کی آبیاری اور فروغ میں ان کا کردار کم تھیں۔
جنگ عظیم کے بعد شائع ہونے والے پرچوں میں پشتو اور زلمے پشتون قابل ذکر ہیں۔ نن پرون دہلی
سے بیرسٹر نصر اللہ اور مولانا عبد القادر کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا قیام پاکستان کے بعد تک جاری
رہا(۱۳)

یوں پشتو میں جدید اصناف ادب کے لئے راستے ہموار ہو گئے اور بیسویں صدی عیسوی کے
آغاز سے قیام پاکستان تک کے دور میں وہ اصناف بھی پشتو میں داخل ہوئیں جو مغربی ادب سے اردو
اور دیگر مشرقی زبانوں میں داخل ہو گئی تھیں یہی وہ دور ہے جس میں پشتو جدید اصناف ناول، ڈرامہ
افسانہ، انشائیہ، رپورتاژ اور دیگر نثری اصناف سے آشنا ہو گئی اور قیام پاکستان تک ان اصناف سے مالا
مال ہو گئی اور نثری اصناف کے ساتھ ساتھ منظوم ادب کی جدید اصناف اور جملہ جدید رجحانات و میلانات
بھی پشتو ادب میں داخل ہو گئیں۔ یہیں سے پشتو ادب کا پانچواں اور جدید دور شروع ہوتا ہے جو قیام
پاکستان تک اور پھر قیام پاکستان کے بعد بھی جاری و ساری رہتا ہے۔ ہم اگر پشتو کے پانچویں دور اور
جدید ادب کے بارے میں انتہائی اختصار کے ساتھ وضاحت کریں تو یوں کہا جا سکتا ہے۔

آج ہم جس ادب کو جدید کہتے ہیں اس کی ابتداء بیسویں صدی میں ہوتی ہے۔ بیسویں صدی
کو ہم ایک ادبی دور کہہ سکتے ہیں۔ یعنی پشتو ادب کا پانچواں اور آج تک آخری دور یا جدید دور جس میں
مختلف جدید اصناف بھی شامل ہوئیں اور جدید موضوعات، رجحانات اور میلانات بھی۔ جدید ادب کو
پروان دینے میں دو قسم کے لوگ شامل ہیں۔ ایک وہ جو فطری طور پر جدت کو پسند کرتے تھے دوسرے وہ
لوگ جنہوں نے جدید علوم و فنون کا مطالعہ کیا ہے اور جو جدید طرز فکر، مطالعہ اور مشاہدہ سے آراستہ ہیں۔
اس طرح کے کئی نام ہمارے سامنے آ سکتے ہیں مثلاً فضل محمود مخفی، اسلم خان کمالی، کاکاجی صنوبر حسین مومند،
میاں سعد اللہ خان شمیم، عبدالاکبر خان اکبر، محمد اکبر خادم، عبد المالک فدا، عبد الخالق خلیق، ماسٹر عبد الکریم
وغیرہ۔ ان سب نے پشتو کی جدید نثر و نظم میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ان سب سے پہلے جس شخص
نے پشتو ادب میں صحیح معنوں میں جدت کا علم بلند کیا وہ سید راحت زاخیلی ہے۔ راحت زاخیلی نے پشتو

میں نئے اصناف کو بھی متعارف کرایا اور نئے رجحانات ومیلانات کو بھی عام کیا۔ پشتو میں طبع زاد ناول نگاری، افسانہ نگاری، ادب لطیف وغیرہ کا تعارف ان ہی نے کیا ہے۔ پشتو صحافت کے ابتدائی سفر میں بھی راحت زاخیلی کا کردار نمایاں ہے۔ پشتو شاعری میں نئے موضوعات اور اصناف کے حوالے سے جدید نظم کو رواج دینے میں راحت زاخیلی نے بڑا کام کیا۔

راحت زاخیلی کے بعد پروفیسر عبدالحمید افغانی، مولانا عبدالقادر، امیر حمزہ خان شنواری، سمندر خان سمندر، دوست محمد کامل، بہادر شاہ ظفر کاکاخیل، عبدالغنی خان، ولی محمد طوفان، فضل حق شیدا، سید رسول رسا، قمر راہی، اجمل خٹک، مراد شنواری، خیال بخاری، یونس خلیل، اشرف مفتون اور بعد کے ان گنت شعرا، ادبا وجدت کے اس کاروان میں شامل ہو گئے۔ دوسری طرف سید فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی نے تراجم کے ذریعے پشتو ادب کو جدت سے مالا مال کرنے کی سعی کی۔ یوں آج پشتو کا جدید ادب، پانچواں اور آخری دور یا بیسویں صدی کا ادب اصناف، رجحانات اور موضوعات کے حوالے سے اتنا غنی ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہو گیا ہے(۱۵)

پشتو ادب کے آغاز سے لے کر جدید ادب کے پانچویں دور کا تذکرہ ہم نے انتہائی کے اختصار کے ساتھ کیا۔ اس بحث میں کچھ جدید اصناف کا آغاز قیام پاکستان سے قبل ہو چکا تھا۔ مگر ان کا تسلسل قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ ان اصناف اور رجحانات ومیلانات پر تفصیلی تبصرہ قیام پاکستان کے بعد کے ادبی ارتقاء کے ضمن میں کیا جائے گا مگر اس بحث میں ان اصناف، رجحانات ومیلانات کی طرف سرسری اشارہ کرنا ضروری تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے پشتو کے جدید ادب میں اگر جدید اصناف کا تذکرہ کیا جائے تو ڈرامہ، ناول، افسانہ، انشائیہ، رپورتاژ، شعر نگاری، سفرنامہ بھی پشتو کے جدید ادب کا حصہ بن چکے تھے۔ اسی طرح منظوم اصناف میں نظم کی قدیم وجدید تمام شکلوں کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات ومیلانات، عالمی تحاریک اور دیگر موضوعات بھی پشتو کے جدید ادب میں داخل ہو چکے تھے جن کا تسلسل قیام پاکستان اور پاکستان کے بعد بھی جاری وساری رہا۔ موضوعات ورجحانات میں سے اگر چہ رومانوی شاعری، وجودیت کی تحریک سیاسی وسماجی شعور کی بازگشت اور دیگر معاشرتی مسائل پشتو کے جدید ادب کا حصہ بن چکے تھے مگر قیام پاکستان سے پہلے پشتو کے جدید ادب کا غالب رجحان، سماجی ومعاشرتی مسائل کی ترجمانی، سیاسی تحاریک کی بازگشت اور ترقی پسند شعور کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں پشتونوں کے سیاسی قائد خان عبدالغفار خان کی زیر نگرانی انجمن اصلاح الافاغنہ کے

نام سے اصلاحی وادبی تنظیم کے زیرسایہ پشتو ڈرامہ اور انقلابی وسیاسی شاعری کو جو تقویت ملی اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ انجمن اصلاح الافاغنہ کی بنیاد ۱۹۲۱ء میں پڑی تھی اور ۱۹۴۷ء تک اس انجمن نے نظم ونثر کے کئی گوشوں میں جتنا اضافہ کیا، قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں بھی پشتو کے جدید ادب کا بیش بہا خزینہ کی مانند ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اس تنظیم کے زیر سایہ ادب کا غالب رجحان ترقی پسند شعور کی باز گشت اور سماجی وسیاسی مسائل کی نقاب کشائی کے ساتھ انقلابی اور مزاحمتی ادب کو بھی پروان چڑھاتا تھا لہذا اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس دور کے کئی نامور ادیب، شاعر اور دانشور شعوری کوشش کرتے رہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اور انجمن اصلاح الافاغنہ کے قیام ۱۹۲۱ء کے بعد کے دور میں اس قسم کی مقصدی اور ترقی پسند ادب کے بارے میں خلاصہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

انجمن کے قیام سے پہلے مختلف تحریکوں کے تاثر میں ترقی پسند شاعری تخلیق ہوئی ہے۔ ایک انجمن اصلاح الافاغنہ کے تاثر میں براہ راست اور دوسری انقلاب روس کے تاثر میں۔ ان دونوں تحاریک سے متاثرہ شاعری میں ترقی پسند تحریک کا اثر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے مگر مجموعی لحاظ سے یہ شاعری تحریک سے الگ ہو کر پشتون سماج کے زمینی حقائق، سیاسی منظر نامہ اور انگریز حکمرانوں کے ظالمانہ رویوں کے ردعمل میں تخلیق شدہ ہے اس قسم کی شاعری کا ایک انتخاب جناب اجمل خٹک نے مرتب کر کے اپنے ایک علمی مضمون کے ساتھ "ژوند او فن" (زندگی اور فن) کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے جس سے ہم استفادہ کرتے ہیں اس قسم کی شاعری میں مندرجہ ذیل نمایاں ترقی پسندانہ رویئے ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ ترقی پسند شعراء کو مخاطبہ

۲۔ انقلابی اور مزاحمتی شاعری

۳۔ مزدور و دہقان کی دادرسی

۴۔ مظلوم طبقے کا استحصال (عالمی تناظر میں)

۵۔ قومی اور سیاسی شاعری

درج بالا ترقی پسندانہ رویوں میں کچھ وہ شاعری بھی شامل ہے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے بعد تنظیم کے بنیادی مقاصد کے تاثر میں وقوع پذیر ہوئی ہے لہذا اس حصے کی شاعری کو اپنے موقع پر 1935ء کے بعد شاعری میں زیر تبصرہ لائیں گے۔ فی الحال اُن شاعروں کا مختصر تذکرہ کرتے

ہیں جنہوں نے انجمن اصلاح الافاغنہ کے سیاسی مقاصد سے متاثر ہو کر انگریز سامراج کے خلاف مزاحمت کے طور پر دو ولولہ انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں غریب و لاچار طبقے کے حقوق اور حریت پسندی کے رجحان کا عکس پیش کرتی ہیں۔ ان شعراء میں عبدالاکبر خان اکبر، خادم محمد اکبر، عبدالخالق خلیق، شاد محمد میگے، فضل رحیم ساقی، فضل محمود مخفی، میاں احمد شاہ، عبدالمالک فدا، محمد اسلم خان شرر، امیر نواز جلیا، پیر عبد القدوس تندر، تاج محمد خ موش، الف جان خٹک وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ یہ تمام شعراء مسعود صدی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے پشتو شاعری میں قومیت، مزاحمت، حریت پسندی اور حب الوطنی کے موضوعات داخل کیے (۶)

پشتو میں جدید اصناف، رجحانات، میلانات، تحاریک اور سماجی موضوعات کی ترجمانی کا یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی پوری شدت کے ساتھ جاری وساری رہا اور آج تک پشتو کے جدید ادب اور مختلف اصناف میں وہ فن پارے تخلیق ہوئے ہیں جن کو عالمی ادب کے معیار کا ادب تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پشتو کے جدید ادب میں کیا کیا اضافے ہوئے، کن اصناف میں ہوئے، اور کس معیار کا ادب منصہ شہود پر آ دیا اس کا تذکرہ آئندہ ابواب میں کیا جائے گا جس کو پاکستان کی 75 سالہ ادب کی کہانی یا مختصر تاریخ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

ناول

پشتو میں ناول لکھنے کا آغاز تراجم سے ہوا ہے۔ پہلا ترجمہ شاید ڈپٹی نذیر احمد کا مراۃ العروس ہے جس کا ترجمہ میاں حسب گل کاکاخیل نے ۱۸۷۹ء میں کیا ہے مگر اس کی اشاعت ۱۹۵۷ء میں ہوئی ہے۔ یہ اردو ادب کا بھی پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے دوسرے ناول توبۃ النصوح کا ترجمہ بھی پشتو میں ہوا ہے جو میاں محمد یوسف کاکاخیل ۱۹۰۵ء میں کیا ہے۔ پشتو میں طبع زاد ناول کی ابتدا راحت زاخیلی کے ناول ''نتیجۂ عشق'' سے ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ ۱۹۱۲ء سے لے کر قیام پاکستان ۱۹۴۷ء تک پشتو میں ناول لکھنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ افغانستان کے اسکالر نور محمد ترہ کئی نے ۱۹۳۹ء میں بے ترتیبہ زوے (بے تربیت بیٹا) کے نام سے ناول لکھا جو کتابی صورت میں بہت بعد میں منصۂ شہود پر آیا۔ مذکورہ دونوں ناولوں میں فنی و تکنیکی اعتبار سے بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ باقاعدہ فنی لحاظ سے مکمل اور بہترین معیار کا ناول صاحبزادہ محمد ادریس نے پیغلہ (دوشیزہ) کے نام سے لکھا ہے۔ جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا ہے۔ یوں پشتو میں باقاعدہ طور پر ناول کا آغاز قیام پاکستان کے بعد ہوا ہے۔ صاحبزادہ ادریس کا ناول پشتون معاشرہ میں تعلیم اور روشن فکری عام کرنے کا بنیادی حوالہ بنتا ہے جس میں خواتین میں بھی یونیورسٹیوں تک کی تعلیم دلوانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد پشتو میں دو اہم ناول کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اشرف درانی کا زر کے سترگے (بچھوری آنکھیں) اور امیر حمزہ شنواری کا نوے چپے (نئی لہریں) دونوں ۱۹۵۷ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اگر چہ ان دونوں ناولوں میں کہیں کہیں فنی و تکنیکی خامیاں بھی نظر آتی ہیں مگر مجموعی اعتبار سے یہ دونوں ناول پشتو کے افسانوی ادب (Fiction) کا بیش قیمت سرمایہ مانے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب پشتو ناول۔ تحقیقی اور تنقیدی جائزہ میں ان دونوں ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے آج سے بیس سال پہلے لکھا تھا:

۱۹۵۷ء میں اشرف درانی کا ناول ''زر کے سترگے'' (بچھوری آنکھیں) شائع ہوا۔ جو بنیادی طور پر ایک رومانوی ناول ہے جس میں مصنف نے زیادہ تر اپنے حالات کو بیان کیا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ ناول اتنے اعلیٰ معیار کا ہے کہ صاحبزادہ محمد ادریس کے ناول ''دوشیزہ'' کے بعد یہ ہماری پیاس

سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں دوسرا اہم ناول شائع ہوا۔ وہ حمزہ بابا کی "نئی لہریں" ہے جسے ہم نظریاتی ناولوں میں شامل کر سکتے ہیں۔ اس ناول پر سیاسی ماحول چھایا ہوا نظر آتا ہے اس ناول میں تحریک خدائی خدمتگار کے مشن اور پشتونوں کے سیاسی نظریات کو ادبی پیرائے میں پیش کیا گیا اور پشتو زبان کی اہمیت اور مادری زبان پشتو میں تعلیم کے حصول کے بارے میں ایک واضح نظریہ موجود ہے۔ اس ناول کے علاوہ حمزہ بابا کی دیگر تحریروں میں بھی یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے اس ناول پر یہ تنقید بھی کی جا سکتی ہے کہ بغیر پلاننگ کے ناول کے تمام اجزا غیر متوازن شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ خصوصاً کردار نگاری اور زاویہ نظر کی بڑی خامیاں اس ناول میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً حمزہ بابا نے اس ناول کے ہر کردار کے ذریعے اپنی شخصیت اور نظریات کے وہ پہلو پیش کیے ہیں جو بالکل واضح ہیں اور جو صرف حمزہ بابا سے ہی مخصوص ہیں۔ حمزہ بابا کی شاعری کے بڑے بڑے موضوعات پشتون ولی، تصوف اور فلسفہ کی عکاسی اس ناول میں واضح شکل میں ہیں۔ اکثر موقع پر حمزہ بابا نے کردار کے تقاضوں اور مزاج کے خلاف اپنی شخصیت اور نظریے پر زور دیا ہے جو ایک واضح فنی خامی ہے جسے فکشن (Fiction) کی اصطلاح میں زاویہ نظر کی تکنیکی خامی کہا جاتا ہے۔ مگر رنج کے کردار کے ذریعے تصوف اور فلسفہ کی نمائندگی بھی بڑی حد تک ایک غیر فطری عمل ہے۔ ان تمام خامیوں کے باوجود یہ پشتو کے ابتدائی ناولوں میں کافی اہمیت کا حامل ہے (۱۸)

اس دور میں رشید علی دہقان نے "د سرو تعویذ" (سونے کا تعویز) لکھ کر پشتو ناول نگاری میں ایک نیا تجربہ کیا کہ پورا ناول مکالماتی اسلوب میں لکھا اور اس وجہ سے بعض ناقدین نے اسے ڈرامہ بھی کہا۔ یوں پشتو میں ناول نگاری کا یہ سلسلہ جاری وساری رہا اور ایک ہی دور میں تین بڑے ہم عصر ناول نگار سامنے آئے۔ افغانستان کے سابقہ صدر نور محمد ترکئی کے چھ، سید رسول رسا کے پانچ اور ڈاکٹر شیر زمان طائزی کے پانچ ناول قریب قریب ایک ہی دور میں شائع ہوئے۔ چونکہ ہم نے قیام پاکستان کے بعد پشتو ناول کے ارتقا پر بحث کرنی ہے لہذا نور محمد ترکئی کے ناول یہاں ہمارے بحث کا موضوع نہیں۔ البتہ سید رسول رسا اور ڈاکٹر شیر زمان طائزی نے اپنے ناولوں کے ذریعے پشتو کے السانوی روپ میں معیار و مقدار دونوں کے لحاظ سے قابل قدر اضافہ کیا۔ سید رسول رسا نے "مفرور" کے نام سے اپنا پہلا ناول ۱۹۶۳ء میں شائع کیا اور پھر اس کے بعد مسلسل چار دیگر ناول ڈھئی، مسوئی، خودکشی اور بیگانہ منصۂ شہود پر لے آئے۔ ان کے ابتدائی چار ناولوں میں پاکستان کے پشتون سماج سے وابستہ مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے اور آخری ناول بیگانہ میں پاکستان، افغانستان اور ایران کے تہذیبی پس منظر میں پشتونوں کی سماجی

زندگی کے مختلف کرداروں کی نقاب کشائی کی ہے اگرچہ سید رسول رسا کے ناولوں میں کہیں کہیں فنی اعتبار سے خامیاں بھی پائی جاتی ہیں مگر مجموعی لحاظ سے انھوں نے پشتو ادب میں بیش قیمت ناولوں کا اضافہ کیا ہے۔ سید رسول رسا کے علاوہ پاکستان کے پشتون ناول نویسوں میں ڈاکٹر شیر زمان طائزی ناول کے میدان کا ایک بڑا اور سربرآوردہ نام ہے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی تین ناول شیر زمان کے نام سے شائع کیے ہیں۔ بعد میں اپنے قلمی نام ڈاکٹر شیر زمان طائزی رکھ کر دو اضافی ناول پشتو کے افسانوی ادب کا حصہ بنا گئے۔ ڈاکٹر شیر زمان طائزی کے ناولوں کے بارے میں اپنی کتاب پشتو زبان وادب کی تاریخ میں، میں نے ۲۰۰۹ء میں یوں لکھا تھا:

شیر زمان ظمون (ڈاکٹر شیر زمان طائزی) پشتو ناول نگاری کی ایک اور توانا آواز اور معتبر حوالہ ہے جنھوں نے پشتو میں پانچ معیاری ناولوں کا اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا پہلا ناول "گل خان" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا جو فنی لحاظ سے ایک مکمل اور معیاری ناول ہے۔ یہ ناول پشتون سماج میں غلط رسومات، جہالت، لاعلمی، بے جا ناپرستی، تضاد اور ان کے نقصانات کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول کے بعد ان کے دیگر ناول امانت، رحمٰن کورونہ نجوشہ، اور وادہ نشو (شادی نہ ہو سکی) کے نام سے شائع ہوئے۔ آخری ناول ۱۹۹۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے ناولوں میں پلاٹ کی تنسیق، اعلیٰ کردار نگاری، خوبصورت منظر کشی، سسپنس اور گہرے مشاہدے کی چھاپ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ انھوں نے ناول میں فنی تجربے بھی کیے ہیں اور پشتو میں جاسوسی اور مافوق الفطرت عناصر پر مبنی ناول بھی نہایت دلکش پیرائے اور منفرد انداز میں لکھے ہیں(۱۸)

سید رسول رسا اور ڈاکٹر شیر زمان پشتو کے بڑے اور نمائندہ ناول نگار سمجھے جاتے ہیں اور ان دونوں نے بلا شک وشبہ پشتو ناول کو فنی تکنیک اور موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے بہت کچھ دیا ہے۔ مذکورہ دونوں ناول نگاروں کے علاوہ سلطان محمد خان عرف بانو خان کا نام اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے پشتو میں نفسیاتی اور جنسی موضوعات پر ناول لکھنے کا اضافہ کیا۔ اس موضوع پر پشتو میں ایک آدھ ناول ہی ملتے ہیں مگر حقیقی معنوں میں بانو خان نے بہت جرات مندی سے اس طرف خصوصی توجہ دی ہے

پشتو میں جنسی ناول آٹے میں نمک کے برابر ہیں اور جو ناول ہیں وہ بھی نفسیاتی پس منظر کی روشنی میں نہیں بلکہ فحاشی اور جنسی لذت انگیزی پھیلانے کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔ اشرف درانی کا ناول "زرکے سترگے" (چکوری آنکھیں) میں جنسی اثرات کی معمولی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس قسم

کی ناول نگاری کو شعوری طور پر جس لکھاری نے ترقی دی وہ سلطان محمد خان ہیں جو ادبی دنیا میں ماٹو خان کے نام سے متعارف ہیں۔ ماٹو خان نے پشتو ادب کو تین ناول دیے جو نوعیت کے لحاظ سے ایک نیا تجربہ ہیں اور پشتو ادب میں جنسی ناول نگاری کا درست آغاز بھی ہے۔ ان ناولوں کے نام یہ ہیں (ٹوٹا ہوا آئینہ) دوسرا "انتظار" اور تیسرا (چہرے اور داغ)

ماٹو خان کے تینوں ناول موضوع اور تھیم (Theme) کے حوالے سے ایک دوسرے کے کافی قریب ہیں تینوں ناولوں میں پشتون، فرنگی، ہندو، سکھ اور برصغیر کی دوسری اقوام کی نفسیاتی، معاشرتی اور جنسی ماحول کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن اس نشاندہی سے زیادہ فحاشی کو پھیلایا گیا ہے جسے ایک پشتو معاشرہ قبول کرنے کو ابھی تک تیار نہیں۔

ماٹو خان کا پہلا ناول (ٹوٹا ہوا آئینہ) دسمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ جو پشتو ناول کے میدان میں پہلا موضوعاتی تجربہ ہے لیکن فنی عناصر کے لحاظ سے ایک کمزور تجربہ ہے۔ اس کے آغاز میں ماٹو خان نے وضاحت کی ہے کہ ادب میں نظم میں کافی رومانوی اور عشقیہ مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ نثر میں بھی اس کمی کو پورا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کی خاطر ماٹو خان لکھتے ہیں۔

"ہم نے اس کمی کی پوری میں فی الحال نظم کی طرح نثر میں بھی عشق کا انتخاب کیا۔ اور چادرے نیچے (ٹوٹا ہوا آئینہ) ناول لکھ ڈالا۔ قارئین کو چاہیے کہ اسے ایک ناول کے نقطۂ نظر سے پڑھیں۔ آخر کار ناول ہے کوئی انیس الواعظین تو نہیں"

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ماٹو خان نے اس ناول میں جو فحاشی پھیلائی ہے وہ اسے ایک ناول کا لازمی جز سمجھتے ہیں۔ یہ ناول کا لازمی جز تو نہیں البتہ انسانی زندگی کا ایک اہم جز ہے اور زندگی کی بھرپور عکاسی ناول کے علاوہ کسی اور صنف میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے جنسی ناول لکھنا وقت اور انسانی مسائل کی ضرورت ہے۔ عالمی ادب مثلاً انگریزی، اردو میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ پشتو میں ماٹو خان کو اس کا احساس ہوا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر انہیں یہ احساس بھی ہوتا اور وہ اس ناول کو فنی ضروریات کی روانی میں تکمیل تک پہنچاتے۔ ماٹو خان کے (شکستہ آئینہ) میں انسانی زندگی کے اس مسئلے کو علامتی انداز میں پیش کیا جاتا تو اس سے ناول کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی لیکن بدقسمتی سے اس ناول میں علامتی انداز تو دور کی بات ناول کے دیگر بنیادی فنی عناصر بھی نظر نہیں آتے۔

"چادرے تلے" (شکستہ آئینہ) کے دیباچے میں نصر اللہ خان نصر مرحوم لکھتے ہیں: "ناول کے

کردار امریکن اور پاکستانی ہیں۔ نام بھی فرضی ہیں۔ مشرقی مغربی معاشرے کے زیر اثر کرداروں کے ارتقاء کی کوشش کی گئی ہے"

ناول کا موضوع کچھ اس طرح ہے کہ انڈرسن کی بیوی میج کے ایک پشتون شاہ زمان کے ساتھ تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ وہ شاہ زمان کو پسند کرتی ہے۔ انڈرسن کو جب ان تعلقات کا پتہ چلتا ہے تو وہ اسے چھوڑ جاتی ہے اور میج شاہ زمان کے گھر چلی جاتی ہے اور پھر شاہ زمان اس کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے اس کے بارے میں ناول سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"میج نے ہچکیوں میں ساری کہانی بیان کی۔ وہ روتی رہی اور شاہ زمان نے اپنی زبان سے اس کے آنسو پونچھ لیے۔ میج بستر میں لیٹی۔ شاہ زمان بھی پہلو میں لیٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ میج نے جمپر اتار دیا۔ گلاب کی طرح اناری گرم جسم کے شفتالو ایک لمحے میں میج نے سسکیاں لینی شروع کیں۔ جنسی سسکیاں دونوں کے لب ٹکیلے تھے۔ میج نے کچھ محسوس کیا ایک خوبصورت قسم کا درد سینے میں اٹھا۔ میج نے سمجھا کہ شاہ زمان واقعی میرے لیے پیدا ہوا ہے"۔

ماثو خان کے سارے ناولوں میں اس قسم کے مناظر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اور ناول کا بنیادی مقصد لذت آمیزی ہی ہے۔ یہ ناول دارالتصنیف پشاور نے شائع کیا ہے۔

ماثو خان کا دوسرا ناول "انتظار" جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول رومانی اور جنسی ہے۔ اس میں پشتون معاشرے کے معاشرتی اور مذہبی مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ناول ۱۹۲۵ء کے بعد کے برصغیر کے معاشرتی اور سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اسے نیم تاریخی ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بڑے کردار رسالدار گل مست خان، خان مست، عصمت اور اورنگزیب کے ہیں۔ رسالدار گل مست خان ایک بارعب وضع دار پشتون ہیں۔ خان مست ایک عیش پرست کردار ہے۔ نرگس خان مست کی معشوقہ ہے اور عصمت اور اورنگزیب کے عشق کی داستان اور جنسی تعلق بھی اس ناول کا اہم حصہ ہے۔ اس ناول میں انسانی رویوں اور ظلم و ناانصافیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کا نام انتظار اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ نرگس کا عاشق خان مست فوج میں بھرتی ہوتا ہے اور نرگس ملازمت سے واپسی تک اس کا انتظار کرتی ہے۔ اس عرصے میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ خطوط کے ذریعے رابطہ کرتے رہتے ہیں۔ ماثو خان کے مزاج کے مطابق اس ناول میں جا بجا بوسہ لینے، بغل گیر ہونے اور ایک دوسرے کے ساتھ لپٹنے کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ اس کا ایک اقتباس مشت از نمونہ خروار" کے

مصداق پیش کرتا ہوں۔

نرگس اور عصمت کے درمیان مکالمہ خان نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

نہیں نہیں! اس کے ساتھ لیٹنا میرا ایک رات کے لئے ہوگا۔ نرگس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا اور کہنے لگی۔

"عصمت کی اس سے محبت بڑھتی ہے۔ نرگس میرا دل دھڑکتا ہے جب وہ مجھے یاد آتا ہے میں سمجھتی ہوں بوسے ہوں اور ایک دوسرے سے لپٹنا ہو اور کچھ بھی نہ ہو۔ تم نادان ہو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ مرد صرف بوسہ لینے اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے پر اکتفا کرتے ہیں تو تم اپنے آپ کو کیسے قابو میں رکھتے ہو۔ جب مجھے خوف لاحق ہوتا ہے تو میں ایک حربہ استعمال کرتی ہوں میں رنڈی ہوں پھر ایک گھنٹہ تک کوئی مجھ سے بوسہ بھی نہیں لے سکتا"۔

یہ ناول ۱۹۴۲ء تک برصغیر کے سیاسی اور معاشرتی حالات کا نقشہ پیش کرتا ہے اور دوسری جنگ عظیم کا پس منظر بھی دکھاتا ہے۔ اس ناول سے اگر جنسی اور فحاشی کے عنصر کو نکالا جائے اور صرف برصغیر کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر یہ ناول اُردو کی مستور ناول نگار خدیجہ مستور کے ناول سے بڑی حد تک منفرد بنتا ہے اور اپنے مشاہدے کی روشنی میں اس کو انفرادیت حاصل ہوتی ہے۔

ماتو خان کا یہ ناول فنی روایت کے ارتقائی نقوش پیش کرتا ہے جو قابل تعریف ہے۔ ماتو خان کا تیسرا ناول "ہیرے اور دارے" (ہیرے اور دارکھ) کے نام سے شائع ہوا ہے جس پر سن اشاعت درج ہیں۔ موضوع وہی پشتونوں اور مغربی لوگوں کے مشترکہ ماحول کی ترجمانی ہے۔ اس ناول کے خاص کردار ڈاکٹر مریم، ڈاکٹر ناز اور شاہ عالم وغیرہ ہیں۔ اس ناول میں ماتو خان نے جنس سے زیادہ انسانی اور کائنات کے فلسفے پر بحث کی ہے۔ یہ بھی پشتو ناول نگاری کے میدان میں موضوع کے لحاظ سے ایک نیا تجربہ ہے۔ یہ ماتو خان کے جدت پسند ذہن کا اہم کارنامہ ہے۔ ماتو خان کے بعد اور ناول نگاروں نے جنس، فلسفے اور نفسیاتی ناول کی روایت کو ترقی نہیں دی۔ اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس روایت کا ماتو خان نے آغاز کیا اور وہ ہی اس روایت کے خاتم بھی ہیں۔ اس کریڈٹ نے ماتو خان کو پشتو ناول کے میدان میں ایک اہم اور ممتاز مقام بخشا ہے(۱۹)

قیام پاکستان کے بعد پشتو ناول کے سفر کو دیکھتے ہوئے ایک اور اہم گوشہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ گوشہ پشتو میں تاریخی ناول نگاری کا ہے۔ تاریخ اور ناول دو الگ چیزیں ہیں مگر تاریخ کو افسانوی

رنگ میں پیش کرتے ہوئے تاریخی ناول نگاری کا شعبہ افسانوی ادب کا حصہ بن گیا ہے۔ پشتو میں چند تاریخی ناول افغانستان میں بھی لکھے گئے ہیں مگر پاکستان کے پشتون ناول نگاروں میں سب سے معتبر نام سوات کے رحیم شاہ کا ہے۔

بی بی مبارکہ افغان اکیڈمی سوات نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا ہے۔ پشتو خوا کے دو نامور دانشوروں سید تقویم الحق کاکاخیل اور حبیب اللہ رفیع نے اس پر لکھا ہے۔ محترم سید تقویم الحق کاکاخیل نے ایک دو صفحات میں رحیم شاہ رحیم کے ناول پر اظہار خیال کیا ہے۔ جو موزوں اور موقع محل کی مناسبت سے ہے اور باقی ناول کے فن پر ایک طویل مقالہ یا تبصرہ لکھا ہے۔ میرے خیال میں اس موقع پر اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میاں صاحب اگر ناول کے عمومی فن کی بجائے پشتو ناول کے ارتقاء پر ایک الگ مقالہ لکھ ڈالتے اور رحیم شاہ رحیم کے ناول کے بجائے کسی اور رسالے میں علاحدہ چھاپتے تو اچھا ہوتا اور مفید بھی۔ ناول کے قارئین کو ناول کے فن اور اجزاء سے کیا واسطہ؟ جو مخصوص قارئین ہیں یعنی جو ناول کے فنی اجزاء سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں۔ وہ انگریزی اور اردو بھی لکھتے ہیں وہ وہاں یہ براہ راست کیوں نہ پڑھیں۔ بجائے میاں صاحب کا پشتو مقالہ پڑھنے کے۔

اسی طرح حبیب اللہ رفیع نے بھی اپنی تحریر کو بہت طول دیا ہے لیکن اس کے باوجود تحریر میں ربط موجود ہے اور رحیم شاہ رحیم کے ناول کے متعلق بھی بہت کچھ قلم بند کیا ہے۔ میاں تقویم الحق کاکاخیل اپنی تحریر میں ناول کے موضوع کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "بی بی مبارکہ کی کہانی یوسفزیوں کی تاریخ کا بہت اہم حصہ ہے جس کا پشتونوں کی تاریخ پر بہت اثر ہے۔ بی بی مبارکہ کی برکت سے مغل دہلی تک چلے گئے اور یوسفزی رہ گئے پھر شہنشاہ اکبر کے دور تک کوئی بھی یہاں قدم نہ رکھ سکا۔ اکبر نے بھی اپنی بدبختی کی وجہ سے اپنی سلطنت کو کابل تک محدود رکھا۔ اس کہانی میں حقیقت کتنی ہے اور افسانہ کتنا یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا۔

محترم رحیم شاہ کا یہ ناول فنی لحاظ سے بہت اعلیٰ ہے۔ تاریخی واقعات کو کہانی (Fiction) کی شکل اتنی ہنرمندی، خوبصورت اور اعلیٰ پائے کی کردار نگاری سے دی ہے کہ حقیقت اور افسانے کا ایک حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ واقعات کا ربط قارئین کے تجسس کو قدم بہ قدم بڑھاتا ہے اور ناول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس ناول پر رحیم شاہ رحیم قابل داد اور لائق صد تحسین ہیں۔

تاریخی ناول نگاری کا یہ اعلیٰ معیار جو رحیم شاہ رحیم نے مقرر کیا تھا وہ سوات ہی کے باشندہ محمد

خان نے برقرار رکھا اور "دشت لوذ کا مسافر" لکھا۔ ان جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول دوسری جنگ عظیم کے اُن غازیوں اور شہیدوں کے کارناموں کے متعلق لکھا گیا ہے جنہیں اُن کی قربانیوں کا وہ صلہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ ناول میں مصنف نے ایک نوٹ لکھا ہے "دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھا گیا ناول" ناول کا انتساب بھی موضوع کے مطابق ہے انتساب کے الفاظ کچھ یوں ہیں "ان نامعلوم غازیوں اور شہیدوں کے نام جنہوں نے انسان اور انسانیت کی آزادی، خودمختاری، خوشحالی، عزت و احترام کیلئے اپنی جان و مال کا نذرانہ پیش کیا لیکن تاریخ نے اپنے اوراق میں انہیں جگہ نہیں دی اور وہ بھلا دیے گئے (۳۰)

مذکورہ دو ناولوں کے بعد رحیم شاہ رحیم نے سکندر اعظم کے نام سے تیسرا تاریخی ناول بھی لکھا ہے اسی طرح شیرین زادہ خدوخیل کا ناول "غازی" بھی تاریخی نوعیت کا ہے۔ یوں پشتو میں تاریخی ناول نگاری کی روایت بھی خصوصی توجہ کی متقاضی ہے، اسی طرح محمد حسن خلیل نے چند ناول لکھے ہیں جن میں کچھ تاریخی نوعیت کے ہیں اور کچھ مگر سیاسی اور سماجی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

محمد حسن خلیل معروف سماجی کارکن اور دیرینہ مسلم لیگی رہنما محمد اعظم چشتی کے بڑے بھائی ہیں۔ پڑھتے لکھتے آدمی ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر تعینات رہے۔ ایک سال یعنی ۱۹۹۷ء میں پشتو ادب کو چار ناول کا تحفہ دیا جن کے نام یہ ہیں۔

"ظلم مہ کوہ" (ظلم نہ کرو) "فکر مہ کوہ" (فکر نہ کرو) "اسروے مہ کوہ" (اسراف نہ کرو)

ظلم مہ کوہ (ظلم نہ کرو) کا مرکزی کردار گل خان ہے جو بی اے پاس کرنے کے بعد اپنے چچا ماموں اور سسر کی وجہ سے جلاوطن ہوتا ہے۔ یہ تینوں کردار ملک اور قوم کے غدار ہوتے ہیں۔ گل خان فرنگی کا مخالف ہے اُس کے ساتھ پانچ ہزار مجاہدین بھی ہوتے ہیں جو متحدہ ہندوستان کی آزادی کیلئے جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں۔

ناول کا قسیم نیم تاریخی ہے۔ متحدہ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی پس منظر کے واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹا گیا ہے۔ ناول کا اختتام پاکستان کی آزادی کے ساتھ ہوتا ہے۔ محمد حسن خلیل کا دوسرا ناول "اسروے مہ کوہ" (اسراف نہ کرو) ایک بے بس غیرت مند نوجوان داؤد خان کے کارناموں اور موضوع پر لکھا گیا ہے۔ ناول میں معاشرتی برائیوں، کرپشن اور رشوت وغیرہ کے انسداد اور کئی معاشرتی برائیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ناول کے ہیرو داؤد خان کو ایک دلیر بہادر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا ناول "ظلم مه کوه" (ظلم نہ کرو) بھی ایک معاشرتی ناول ہے۔ ناول کی ہیروئین نادرا ہے جو ایک غریب لڑکی ہے۔ شہزادہ اس کے ساتھ بیاہ کرتا ہے لیکن ایک ہی رات کے بعد اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد نادرا کو جن تکالیف اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور معاشرہ اس کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے اس کی المناک داستان کو محمد حسن خلیل نے بڑے خوبصورت پیرائے میں اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔

حسن خلیل کا چوتھا ناول "سیاست مه کوه" (سیاست نہ کرو) اپنے نام کی مناسبت سے موزوں نہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک رومانوی ناول ہے جس میں افضل خان اور شیان کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس ناول میں سسپنس بہت اعلیٰ ہے۔ واقعات کو ڈرامائی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ خطرناک مراحل قارئین کے تجسس کو بڑھاتے ہیں۔ ناول کا ماحول سادہ اور دیہاتی ہے۔(۲۱)

محمد حسن خلیل نے اپنے ابتدائی چار ناولوں کے بعد پانچ مزید ناول پشتو ادب کو دیے ان کے یہ نئے پانچ ناول بھی پہلے کی طرح سیاسی، سماجی اور نیم تاریخی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس دور میں پشتو کے ایک اور ناول نگار پرویز شیخ نے بھی پشتو ناول میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ اُن کا پہلا ناول "سوده ګټه" (گرم پتھر) تو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا مگر پھر ایک طویل وقفے کے بعد ان کا دوسرا ناول "روپے د روح په" (روپیہ روح کے لیے دودھ) کے ساتھ ۲۰۱۱ء میں سامنے آیا اور پھر انہوں نے مسلسل تقریباً تیس ناول تحریر کیے۔ اُن کے ناولوں میں "د ړه کوور غازه" (دل کی چھت کا کنارہ) "مسلمان لیونے" (مسلمان دیوانہ)، "مظلوره" (موتی) "بے زلہ مسافر" (غریب مسافر)، "شپه ګلے" (چھالا)، "کوډه پیره" (کھوٹہ سکہ)، "صوبہ دار خلاف خان"، "جنګوی داخونه" (ادھورے ارمان) اور "کے لارے" (گمشدہ راہیں) اور چند دیگر شامل ہیں۔ پرویز شیخ کے ناولوں کے موضوعات متعدد و متفرق ہیں مگر انہوں نے پشتون دیہاتی ماحول سے زیادہ موضوعات لیے ہیں۔ پشتو ناول نگاری کے اس سفر میں خواتین ناول نگاروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ان خواتین ناول نگاروں میں تاج خٹک، سلمیٰ شاہین، حسینہ گل، رفعت پروین اور افغانستان سے تعلق رکھنے والی چند خواتین بھی شامل ہیں۔ مگر قیام پاکستان کے بعد پاکستانی خواتین ناول نگاروں میں تاج خٹک کا "پیټے" (بوجھ)، سلمیٰ شاہین کا "کہ رڼا شوه" (اگر روشنی ہوگئی)، حسینہ گل کا "ملک" اور رفعت پروین کا "تتے ډیوے" (مدھم دیئے) خصوصی حوالہ بنتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کے لکھاریوں نے بھی چند ناول لکھے ہیں۔ بلوچستان کے ناولوں کو شامل کر کے میں نے چند دیگر متفرق

ناولوں کا تذکرہ اپنی کتاب پشتو زبان کی تاریخ میں یوں کیا تھا۔

بلوچستان میں پہلا ناول ناظر صادق نے "وچه لښته" (درخت کی خشک شاخ) کے نام سے لکھا جو 2005ء میں شائع ہوا ہے۔ ایک سال بعد 2006ء میں افضل شوق نے پروني څيرے (کل کے چہرے) کے نام سے ایک معیاری ناول لکھا۔ اسی طرح افغانستان اور بلوچستان کے علاوہ صوبہ سرحد میں پشتو ناول لکھنے کا تسلسل جاری رہا۔ حبیب اللہ افغانی کا شاہ پری (پری)، دوست خٹک کا گل خوبانہ، ساغر آفریدی کا نوے کهول (نئی نسل)، ش م شیر کا لوظ (وعدہ)، محمد نواز کا شوم (کنجوس)، تاج خٹک کا کنډه په سر (خانہ بدوش) اور پیٹے (بوجھ)، عبدالناصر زخمی کا وړه بي بي (چھوٹی بی بی)، میاں محمل شاہ کا ژوندی مینه (زندہ محبت)، محمد اعظم خان علاری کا شاہین، اشیر دوریال کا ډیوی ذالوی (نذرانہ محبت)، مصطفی جہاد کا دتخت ملے (تخت کا موتی)، قیر الحکیم حکیم زی کا دسیند په غاړه تږے (دریا کے کنارے پیاسا)، محمد ابراہیم شبنم کا اجزاء، اور خواښی انګور (ساس اور بہو)، اور گلابی محمد شریف خان کا حزل در منزل (سفر اور منزل مقصود)، کریم خان کا دوفا لارې (وفا کی راہیں)، سیف الاسلام سیف کا خونړے لټون (خونی تلاش)، بدر الحکیم حکیم زی کا تورونه او سازشونه (بہتان اور سازشیں)، محمد اجان یار کا ساتمہ (شاخ)، محمد قاسم عارف کا سمندری باغیاں (سمندری پانی)، غازی سیال کا ښکری (اژدھا)، بنړے (سوئیٹا) اور کئی دیگر ناول وقتاً فوقتاً لکھے گئے (۲۲)

مذکورہ طبع زاد ناولوں کے علاوہ پشتو میں کثیر تعداد میں ناول دیگر زبانوں سے تراجم کے ذریعے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پشتو میں ناول نگاری کے سفر کا آغاز بھی تراجم سے ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ مسلسل ناول ترجمہ ہوتے ہوئے یہ تسلسل آج تک جاری وساری ہے جس کی بدولت بیسیوں ناول دیگر زبانوں سے پشتو میں تراجم کے ذریعے داخل ہوئے اور کئی پشتو ناول دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ناول نگاری کے سفر میں ان تراجم کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب پشتو زبان وادب کی تاریخ میں ۲۰۰۹ء میں کیا تھا جس کی تفصیل یہاں پیش نظر ہے۔

پشتو میں ناول نگاری کی ابتدا تراجم سے ہوئی ہے۔ ابتدائی دور کے مترجمہ ناول یہ ہیں:

۱۔ نقش نگین: میاں حبیب گل نے 1876ء میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس کو پشتو میں ترجمہ کیا۔ یہ ناول مولانا عبدالقدوس قاسمی کے مقدمہ کے ساتھ 1957ء میں شائع ہوا

۲۔ میاں محمد یوسف کاکا خیل نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح کو 1905ء میں ترجمہ کر

کے اسی نام سے اسی سال شائع کیا۔

۳۔ 1877ء میں جان بنین کی ناول کا انگریزی تحریر کو قاضی عبدالرحمان اور پادری ٹی ہیوز نے ترجمہ کر کے سیر السالکین کے نام سے شائع کیا۔

۴۔ 1939ء میں برہان الدین کشککی کا مترجمہ ناول "پہ پټہ پلټنی" (خفیہ انداز سے کھوج لگانا) شائع ہوا۔

۵۔ امین افغانپور کو مترجمہ ناول "بوډا او سمندر" (بوڑھا اور سمندر) اور محمد اعظم بہر کے کا "تا" اس کے بعد سامنے آئے۔

۶۔ اس طرح پشتو میں ناول کے میدان میں ترجمہ نگاری کی روایت پروان چڑھی اور بیسیوں ناول انگریزی، روسی، جرمن، اردو وغیرہ سے ترجمہ ہوئے۔ میں نے 2000ء میں اپنی کتاب پشتو ناول تحقیقی اور تنقیدی جائزہ میں مترجمہ ناولوں کا ذکر کیا تھا۔ ان ناولوں کی تفصیل یوں ہے:

۷۔ روسی ناول نگار بوریس پولیوی کے ناول کو محمد اللہ نوری نے پشتو میں "د یو واقعی انسان داستان (ایک سچے انسان کی سرگذشت) نام سے ترجمہ کیا جو 1985ء میں روس میں رادوگا نشراتی موسسہ کے اہتمام سے شائع ہوا۔

۸۔ "تږے مسافر" (پیاسا مسافر) کے نام سے لکھے ہوئے میخائیل ساداونو کے روسی ناول کو امین افغانپور نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ناول کمیونزم کے موضوع اور رجعتی کشمکش پر لکھا گیا ہے۔

۹۔ روسی ناول نگار الیکساندر بیتروفیمن کے ناول کو گل جان صاحب نے "ستار پہ تیزۍ غږیګی" (رباب تیزی سے بج رہا ہے) کے نام سے ترجمہ کر کے 1366ھ میں شائع کیا ہے۔

۱۰۔ روسی ناول نگار میخائیلو حتا ملسکی کے ناول کو یوسف صابر نے ترجمہ کر کے رڼې شپې (روشن راتیں) کے نام سے 1365ھ میں شائع کیا ہے۔ ناول انسانی طبقات کی ناہمواری اور عدم توازن پر لکھا گیا ہے۔

۱۱۔ میخائیل شولوخوف کے روسی ناول کو محمد الرحمان سراج نے پشتو میں "د یو انسان برخلیک" (ایک انسان کی تقدیر) کے نام سے 1364ھ میں شائع کیا ہے۔ ناول طبقاتی موضوع پر لکھا گیا ہے۔

۱۲۔ چنگیز ایتماتوف کے ناول کو ملک پرویز نے 1364ء میں "جمیلہ" کے نام سے ترجمہ اور شائع کیا ہے۔

۱۳۔ ٹالسٹائی کے ناول کو یوسف صابر نے ترجمہ کر کے "وطن کمیٹی" کے نام سے 1368ء شائع کیا ہے۔

۱۴۔ چنگیز ایتماتوف کا ناول "وزاخرو وتی راتگ شو تال دے" (کوچ کا وقت پر آنا نیک فال ہے) کے نام سے ترجمہ ہوا جو رادوگا نشراتی موسسہ کے اہتمام سے روس میں 1958ء میں شائع ہوا ہے۔ مترجم کا نام درج نہیں ہے۔

۱۵۔ بورلیس کر وموف کا ناول گل جان صابر نے ترجمہ کیا ہے۔ پشتو میں نام "د آزادی گل گلاب" (آزادی کا پھول) رکھا ہے۔

۱۶۔ نیکولائی استروفسکی کے ناول کو زیور نے پشتو میں "پولاد سنگہ ٹکلید ہ" (فولاد کیسے مضبوط ہوا) کے نام سے ترجمہ کیا ہے اور پروگرس موسسہ ماسکو سے شائع ہوا ہے۔ یہ شاہکار ناول دنیا کی اڑتالیس زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔

۱۷۔ "مشتپہ کرہ" (چھپا کرہ) کے نام سے چیخوف کے ناول کو سیع الدین نے پشتو میں ترجمہ کیا ہے جو 1348ھ میں چھپا ہے۔

۱۸۔ "یو سلو یشتم" (اَسّی اکیسواں) کے نام سے بوریٹل لاوروف کے روسی ناول کو پشتو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ مترجم کا نام معلوم نہیں۔ ناول رادوگا نشراتی موسسہ کی جانب سے 1985ء میں شائع ہوا ہے۔

۱۹۔ اتوک لیکھا کے نام سے ایک ناول کو ملیالم زبان سے پشتو میں برجگوان گاہ ترہ نے ترجمہ کیا ہے جس کا تذکرہ لطیف یوالدش نے اپنی کتاب "پہ ہند کی دا پشتو ژبی او ادبیاتو د انکشاف او روزنی چارو ونہ" (ہند میں پشتو زبان و ادب کا سفر) میں صفحہ 598 پر کیا ہے۔

انگریزی ناول

۲۰۔ جان سٹین بیک کے انگریزی ناول (The Pearl) کا پشتو ترجمہ انجینئر محمد یحییٰ نے مرغلرہ (موتی) کے نام سے کیا۔ یہ ناول افغانستان کے پشتو ٹولنہ نے 1357ھ میں شائع کیا ہے

۲۱۔ جارج اورویل کا ناول رسول امین نے "وردی کمیونیزم ہنداره" (روسی کمیونیزم کا آئینہ) کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

۲۲۔ جارج اورویل کے ایک اور انگریزی ناول کو مرزا ظلم حمیدی نے "ژوبڼ" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ دو ماہوی ناول 1368ھ میں شائع ہوا۔

۲۳۔ امریکی ناول نگار مارک ٹوائن کے ناول نام سائز کو دولت محمد ودین نے ہ 1343 میں پشتو میں ترجمہ کیا ہے جو پشتو ٹولنہ کابل کے اہتمام سے شائع ہوا ہے مرکزی کردار (نام سائز) ایک بچے کا ہے۔

۲۴۔ ایچ رائڈر ہیگرڈ کے انگریزی ناول (She) شی کو ڈاکٹر محمد ناصر نے "مرموزہ ملکہ" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ناول 1988ء میں شائع ہوا ہے۔

۲۵۔ مصری خاتون فردوس کی کہانی پر لکھے ہوئے السعداوی کے انگریزی ناول Woman at Point Zero کو انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں عبدالباری بازی نے لکھا ہے۔

"یہ ایک مصری خاتون فردوس کی کہانی ہے جو قتل کے جرم میں قید اور سزائے موت کے انتظار میں ہوتی ہے۔ اس ناول کو مصنفہ "السعداوی" جو خود ایک ڈاکٹر تھی اور فردوس سے جیل میں ملی تھی نے اس کہانی کو ناول کی شکل میں انگریزی میں شائع کیا اور اسے Woman at Point Zero کا نام دیا جبکہ پشتو میں اسے فردوس یا ملخہ (خواتین کے عمومی پشتو نام) اور خود اس کہانی کے مرکزی کردار فردوس کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس ناول کے پشتو مترجم "شاہ جہاں وگڑ پال" ہیں اور یہ 191 صفحات پر مشتمل ہے۔ جیل میں مقید خواتین اور سزائے موت کے انتظار میں دن رات جیل کی اندھیری کوٹھیوں میں گزارنے والوں کی دل خراش کہانی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ کس طرح ہمارے مرد خواتین کو جب اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں یا جب وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں تو انہیں مردوں کی جانب سے کن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی اس ناول کی خوبی اور مرکزی خیال ہے۔ مذکورہ ناول پہلی بار 1987ء میں عربی میں بیروت سے چھپ کر شائع ہوا مگر عربی ممالک میں ان کی تشہیر پر پابندی لگا دی گئی تھی جبکہ پشتو میں یہ 1995ء میں اے ایس آر پریس لاہور پاکستان کی جانب سے چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس کا پشتو دیباچہ پروفیسر مجاور احمد یار نے یکم جنوری 1995ء کو پشاور میں لکھا ہے۔ ٹائٹل میں پھانسی کے پھندے

میں سفید پھول دکھلایا گیا ہے۔ جوانی جنی سے جدا ہوتا ہے۔

۲۶۔ کمال شیرانی نے والٹیر نے انگریزی ناول (Candid) کو پشتو میں "میجر لے" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

اردو سے پشتو میں مترجمہ ناول

اردو سے پشتو میں مترجمہ ڈپٹی نذیر احمد کے دو ناولوں کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے جن میں پشتو ناول کی صنف کا تعارف ہوا ہے۔ اردو سے پشتو میں دیگر مترجمہ ناولوں میں مندرجہ ذیل کے نام نمایاں ہیں:

۱۔ د شریف سرگزشت، قیام الدین خادم شریف کی سرگزشت، ڈپٹی نذیر احمد پوری 1952ء

۲۔ شاہین، محمد زبیر شفقی، شاہین، نسیم حجازی 1998ء

۳۔ محمد بن قاسم، محمد زبیر شفقی، محمد بن قاسم نسیم حجازی 1998ء

۴۔ د روستے سور قتل، محمد زبیر شفقی، آخری چٹان، نسیم حجازی، 1998ء

۵۔ دیو غازی داستان، محمد زبیر شفقی، داستان مجاہد، نسیم حجازی 2000ء

۶۔ د تورے شپے مسافر، محمد زبیر شفقی، اندھیری رات کے مسافر نسیم حجازی 2000ء

۷۔ د روحق جگړه، محمد زبیر شفقی، آخری معرکہ نسیم حجازی 2000ء

۸۔ د حجاز کاروان، محمد زبیر شفقی، قافلہ حجاز، نسیم حجازی، 2001ء

جرمنی میں لکھا ہوا فارسی سے مترجمہ ناول

ولہلم ٹل" جرمنی کے مشہور شاعر اور ناول نگار شلر کا ایک بہترین ناول ہے جسے محمد جمال زادہ نے ایران میں فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور محترم اشنان نے فارسی سے پشتو میں ترجمہ کیا ہے۔ اشنان نے اس کتاب کے ترجمے میں پوری کاوشیں کی ہیں اور ترجمہ سلیس ہے البتہ طرح طرح کے ترجمے زیادہ وقت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترجمے سے ترجمہ اصل مضمون میں خامیاں پیدا کر لیتا ہے۔ اگر یہ ترجمہ براہ راست انگریزی یا دیگر زبانوں سے ہوتا تو یہ پشتو ادب کے لئے سودمند ہوتا۔ محترم اشنان نے بعض کلمے اپنے سے بنائے ہیں مثلاً (شاہ وزی، شاہ زادہ، پولیس کوٹ، مسافر خانہ اور پوہن

ڈاڑے وغیرہ)۔ ڈیلفم تن کا ترجمہ محترم امتنان نے کیا ہے اور پشتو میں شائع ہوا ہے۔

عربی سے مترجمہ ناول

نړۍ په دوه زرم کال کښې:(2000ء)

یہ ناول ایک عربی ناول سے ترجمہ کیا ہے جس کا عربی نام "العالم فی عام 2000" ہے اور اس کے پشتو مترجم عبدالرزاق واسعی ہیں۔ یہ 1336ء میں چھپ کر شائع ہوا ہے یہ جدید سائنسی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کا دیباچہ گل پاچا الفت نے لکھا ہے۔

فارسی سے مترجمہ ناول

صالح محمد صالح نے ربیع انصاری اور محمد حجازی کے دو ناولوں کو بالترتیب "پاخوہ ورژیدہ" اور "ناندرہ" کے ناموں سے ترجمہ کیا ہے دونوں ناول مطبوعہ ہیں۔

بنگالی سے مترجمہ ناول

بنگالی سے پشتو میں جن ناولوں کے تراجم ہوئے ہیں ان میں بنگالی شاعر و ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کے دو ناولوں میں سے محمد یوسف ایازی نے "باغبان" اور محمد عظیم اسر کے نے "تاج" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ دونوں ناول مطبوعہ ہیں۔ ڈاکٹر زیور نے شبنم کے نام سے سید مجتبیٰ علی کے ناول کو ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اگرچہ یہ ناول بنگالی ناول نگاروں نے لکھے ہیں لیکن یہ واضح نہیں کہ مترجمین نے بنگالی سے براہ راست ترجمے کیے ہیں یا کسی اور زبان کی وساطت سے کیے ہیں۔

ہندی سے مترجمہ ناول

اگرچہ ہندی اور اردو الگ زبانیں نہیں لیکن ہندوستان کے دانشور سنسکرت کے الفاظ کو نمایاں کر کے اردو کو ہندی کا نام دیتے ہیں۔ اس قسم کی ہندی سے پشتو میں پریم چند کے ناول گئودان (گائے کا صدقہ) کو پشتو میں روشن لال طبیب زوے نے "د غوائی خیرات" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں عبدالہادی ہازئی نے لکھا ہے۔

''اس ناول کے مصنف منشی پریم چند ہیں۔ پشتو میں اسے ''دغوا خیرات'' کے نام سے روشن لال ملہوترہ نے شائع کیا ہے مگر سن اشاعت نہیں دیا ہے۔ یہ 169 صفحات پر مشتمل ناول ہے۔ گئودان کا پشتو ترجمہ یہاں دستیاب نہیں ہے اور یہ روشن لال ملہوترہ کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے جو کہ بھارت میں واقع ہے۔ مترجم نے اسے دو حصوں میں ترجمہ کیا ہے۔

گئودان جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ یہاں عدم دستیاب ہے لہذا اس کے اردو ایڈیشن سے متعلق بعض ناقدین کی آرا اس طرح ہیں:

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ میں قمر رئیس فرماتے ہیں:

گئودان جو پریم چند کا آخری ناول ہے۔ اردو اور ہندی کے بیشتر ناقدین نے اس کو نہ صرف پریم چند کا بلکہ اردو اور ہندی کا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ بہت سی فنی خرابیاں جو ان کی پچھلی تصانیف میں ملتی ہیں اس ناول میں نظر نہیں آتیں۔

ہوری کو ناول کا ہیرو بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہوری کی یہ کہانی فن کے اعتبار سے اتنی مربوط اور مکمل ہے کرداروں کا ارتقاء، واقعات کا سلسلہ اتنا رواں و فطری ہے کہ قاری کی دلچسپی ایک لمحے کے لئے بھی کم نہیں ہوتی۔ پریم چند کے فن کا کمال یہ ہے کہ اس میں وہ کسی مثالی نوجوان کے بجائے گاؤں کے ادنیٰ اور بوڑھے کسان کو ہیرو بناتے ہیں۔

آگے فرماتے ہیں فنی تکمیل کے اعتبار سے پریم چند کا یہ ناول مسلمہ طور پر ان کی سب سے کامیاب تخلیق ہے۔ اس ناول کی کامیابی کا ایک سبب زبان پر پریم چند کی فنکارانہ قدرت بھی کہی جا سکتی ہے۔

ناول نگار کو ایک ہی ناول میں مختلف طریقہ اظہار و بیان سے کام لینا پڑتا ہے مثلاً واقعہ نگاری کا بیان کچھ اور ہوگا۔ مکالمہ نگاری میں کرداروں کا ذہنی سطح پر اور ان کے مخصوص ذخیرہ الفاظ، ان کے مزاج اور ماحول، محاوروں اور لب و لہجہ کا خیال رکھنا، منظر نگاری کا ڈھنگ اس سے مختلف ہوگا اور ظرافت نگاری میں دوسرا۔

''آگے چل کر موصوف پریم چند کے تصور حیات کو مہاتما گاندھی اور ٹالسٹائی کے فلسفہ زندگی کے قریب بتلاتے ہیں۔ پریم چند ایک مثالی زندگی کا تصور رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ تصور حیات عملی نہیں کہا جا

سکتا تعجب ہے کہ ایک ایسا ادیب جو زندگی سے اس قدر قریب رہا اور جو عام انسانوں کے دکھوں ان کی محرومی و مظلومی سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کی بہتر اور نجات ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا، یہاں زندگی کا ایسا مثالی تصور پیش کرتا ہے۔

''گئودان (1936) کا ایک گہرا ادب ہے کیونکہ وہ عوام کے نزدیک ہے کیونکہ وہ انسانی لوٹ کھسوٹ کے ان تمام طریقوں کو ننگا کرنا چاہتا ہے جو سرمایہ داری کی جڑ ہے۔ یہ ناول اپنے وقت کے نظام کے خلاف ایک ذہنی بغاوت تھی۔

پشتو سے دیگر زبانوں میں مترجمہ ناول

بعض غیر مستند ادبی ذرائع کے مطابق پشتو کے بعض ناول روسی اور فارسی زبانوں وغیرہ میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں پشتو ناولوں کے ترجمہ ہونے پر اس لئے اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک تو اس سلسلے میں فی الوقت کوئی تحریری ثبوت نہیں مل رہا اور دوسری جانب افغانستان میں جاری مسلسل خانہ جنگی اور بالخصوص سوویت یونین کو سیاسی اور جغرافیائی نقشہ بدلنے کے بعد حالات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق معلومات ایک سہانا خواب بن چکے ہیں اور یہ سہانے خواب تب حقیقت کا روپ دھار سکیں گے جب تک بالخصوص افغانستان میں مکمل خانہ جنگی کا خاتمہ نہ ہو اور وہاں ایک مستقل و مستحکم نظام حکومت قائم نہ ہو۔

پائندہ محمد خان کے پشتو ناول "دوشت اودہ مسافر" (دشت اور مسافر) کو فاضل خان آفریدی نے انگریزی میں اور محمد شمیم فاروقی نے اپنے پشتو ناول "ہر ورے" کو ہرجائی کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ دونوں ناول مطبوعہ ہیں۔

طاہر آفریدی کے پشتو ناول "کانتو کښې د گونہ" (رنگ سنگ) کو امیر منگل نے اردو میں کہساروں کے پہلوٹ کے نام سے ترجمہ کیا ہے جو آصف فرخی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔(۲۳)

پشتو میں ناول نگاری کے اس سفر کے بارے میں فنی و فکری حوالے سے مختلف ادوار میں مختلف دانشوروں کے آراء سامنے آئی ہیں جن میں دو آراء پیش کرتا ہوں۔ پہلی رائے جناب ایوب صابر نے اپنی کتاب "جدید پشتو ادب" میں ۱۹۵۷ء میں دی تھی جس میں انہوں نے اپنے ناول کا بھی تذکرہ کیا تھا

سکتا تعجب ہے کہ ایک ایسا ادیب جو زندگی سے اس قدر قریب رہا اور جو عام انسانوں کے دکھوں ان کی محرومی و مظلومی سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کی بہتری اور نجات ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ یہاں زندگی کا ایسا مثالی تصور پیش کرتا ہے۔

''گئودان (1936) کا ایک گہرا ادب ہے کیونکہ وہ عوام کے نزدیک ہے کیونکہ وہ انسانی لوٹ کھسوٹ کے ان تمام طریقوں کو ننگا کرنا چاہتا ہے جو سرمایہ داری کی جڑ ہے۔ یہ ناول اپنے وقت کے نظام کے خلاف ایک ذہنی بغاوت تھی۔

پشتو سے دیگر زبانوں میں مترجمہ ناول

بعض غیر مستند ادبی ذرائع کے مطابق پشتو کے بعض ناول روسی اور فارسی زبانوں وغیرہ میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں پشتو ناولوں کے ترجمہ ہونے پر اس لئے اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک تو اس سلسلے میں فی الوقت کوئی تحریری ثبوت نہیں مل رہا اور دوسری جانب افغانستان میں جاری مسلسل خانہ جنگی اور بالخصوص سوویت یونین کو سیاسی اور جغرافیائی نقشہ بدلنے کے بعد حالات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق معلومات ایک سہانا خواب بن چکے ہیں اور یہ سہانے خواب تب حقیقت کا روپ دھار سکیں گے جب تک بالخصوص افغانستان میں مکمل خانہ جنگی کا خاتمہ نہ ہو اور وہاں ایک مستقل و مستحکم نظام حکومت قائم نہ ہو۔

پائندہ محمد خان کے پشتو ناول "دوشت او ما مسافر" (دوشت او ما مسافر) کو فاضل خان آفریدی نے انگریزی میں اور محمد شمیم فاروقی نے اپنے پشتو ناول "ہر ورے" کو ہرجائی کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے دونوں ناول مطبوعہ ہیں۔

طاہر آفریدی کے پشتو ناول "کاغذ کنبی رنگونہ" (رنگ سنگ) کو امیر منگل نے اردو میں کمہاروں کے بہ لوگ کے نام سے ترجمہ کیا ہے جو آصف فرخی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے (۴۳)

پشتو میں ناول نگاری کے اس سفر کے بارے میں فنی و فکری حوالے سے مختلف ادوار میں مختلف دانشوروں کے آراء سامنے آئی ہیں جن میں دو آراء پیش کرتا ہوں۔ پہلی رائے جناب ایوب صابر نے اپنی کتاب "جدید پشتو ادب" میں ۱۹۵۷ء میں دی تھی جس میں انہوں نے اپنے ناول کا بھی تذکرہ کیا تھا

اور لکھا تھا:

اس سلسلے میں ایک کوشش راقم الحروف نے بھی کی تھی اور عجب خان آفریدی کے عزم وثبات کی سچی داستان کو ناول کی جدید تکنیک کے پیش نظر رکھ کر الفاظ کے قالب میں ڈھالنا شروع کیا تھا مگر اس کا یہ کام اب تک محض اس لئے نامکمل ہے کہ سرکاری فائلوں میں عجب خان کی قانون شکنی کے جو واقعات محفوظ ہیں۔ ان کا شمار اب بھی محض اس لئے خفیہ دستاویزات میں ہوتا ہے کہ اس میں چند پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔

پشتو ادب میں دو ناولوں "دواتیز" (روٹی) اور "صبر" کا اضافہ پریشان خٹک نے بھی کیا ہے جن میں سے ایک بھی ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس لئے ان کے ادبی مقام کا تعین ابھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ پریشان خٹک کا شمار پشتو کے ذہین ترین افراد میں ہوتا ہے اور جدید ادب کی کوئی بھی صنف ان کی گرفت سے باہر نہیں ہے مگر جہاں پشتو ادب کے سید رسول رسا جیسی بڑی شخصیات نے پشتو ناول میں صرف کمیت کے اعتبار سے اضافہ کیا ہے وہاں کسی اور سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

موجودہ جدید دور میں پشتو ادب میں ناولوں کی اس بھرمار کے باوجود راقم الحروف کی ذاتی رائے یہ ہے کہ پشتو ادب میں ایسا ناول ابھی بھی موجود نہیں ہے جس کو صحیح معنوں میں مکمل ناول کہا جا سکے اور جس کو انگریزی یا کم از کم اردو ناولوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے(۲۴)

مگر ایوب صابر کی یہ رائے اُس وقت کی ہے جب پشتو میں ناول نے بہت مختصر سفر کیا تھا۔ ۲۰۰۹ء میں میں نے اپنی کتاب پشتو زبان و ادب کی تاریخ میں یوں لکھا تھا:

پشتو میں ناول کا سفر اگرچہ مختصر ہے مگر اس مختصر سفر میں راحت زاخیلی نے "میخیہ عشق" لکھ کر 1912ء میں ناول لکھنے کیلئے جو راہیں کھولی تھیں آج ان ہی راہوں پر چل کر پشتون لکھاریوں نے بیسیوں ناول لکھے جن میں خصوصی طور پر صاحبزادہ محمد ادریس، امیر حمزہ شنواری، سید رسول رسا، نور محمد ترکئی، شیر زمان محمون، مانو خان، حسن خلیل، رحیم شاہ رحیم، پائندہ محمد خان اور طاہر آفریدی نے معیار و مقدار دونوں کے لحاظ سے پشتو ناول کا دامن تخلیقی موتیوں سے بھر دیا ہے۔ ان لکھنے والوں نے موضوعاتی تنوع اور رنگارنگی کے علاوہ فنی اور تکنیکی لحاظ سے بھی پشتو ناول میں خاطر خواہ اضافے کیے۔ یہاں یہ وضاحت بھی کرنا ضروری ہے کہ پشتو ناول اردو یا انگریزی کے تتبع میں نہیں لکھا گیا، اس کی ابتدا پشتون معاشرت کی ترجمانی سے ہوئی اور پشتون لکھاریوں کی فطری صلاحیت اور رجحان نے پشتو میں ناول کی

صنف کے وجود کو حسن بنایا۔ البتہ بعد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ناول نگاروں نے انگریزی، روسی، فرانسیسی اور اردو فکشن کا وسیع مطالعہ اور اپنے سماج کا گہرا مشاہدہ کیا۔ پھر اسی وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کا انعکاس پشتو ناول کے فنی اور فکری پیرایہ میں پیش کیا(۲۵)

پشتو ناول کے فنی وفکری سفر کے بارے میں میری یہ رائے بھی اب پرانی ہوگئی ہے۔ ۲۰۰۹ء کے بعد اب تک تقریباً بارہ سالوں کی مدت میں افغانستان اور پاکستان میں بڑی تعداد میں ناول لکھے گئے مگر ہماری بحث کا مرکز ومحور قیام پاکستان کے بعد پشتو میں پاکستانی ناول نگاروں کی خدمات کا تذکرہ کرنا ہے لہٰذا مجموعی تاثر یہی دیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں دیگر زبانوں کے ادب کے ساتھ ساتھ پشتو ادب نے بھی خوب ترقی کی ہے اور پھر خصوصی طور پر پشتو ناول نگاری کے میدان میں پشتو لکھاریوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اب اس میدان میں تسلی وتشفی کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

افسانہ

پشتو میں افسانہ نگاری کی ابتداء راحت زاخیلی کے افسانے ''کونڈہ جینئی (بیوہ لڑکی) سے ۱۹۱۷ء میں ہوئی ہے۔ ۱۹۱۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک پشتو افسانہ تیس سال تک بہت سست روی کا شکار رہا۔ ابتدائی دور میں راحت زاخیلی کے بعد میاں ازا جگل کا افسانہ ''دھوی پیغام'' (مرے کا پیغام) اور سر بلند خان رکیس کا افسانہ ''دنوب صاحب اشنائی'' (نواب صاحب کی دوستی) زیادہ مشہور ہوا۔ اس ابتدائی دور کے بعد سید رسول رسا، مولانا عبدالقادر، اکرم فاروق شنواری، آ سی اے رحمٰن، امیر حمزہ شنواری، مراد شنواری، ادیب سرحدی اور چند دیگر نے کچھ افسانے لکھے جو پشتو کے مختلف ادبی جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ مگر پشتو افسانے نے قیام پاکستان کے بعد بہت تیز رفتار ترقی کی اور یک وقت بہت بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے نام سامنے آئے۔ آزادی کے بعد ادبی رسائل و جرائد میں بھی افسانے شائع ہوتے رہے اور باقاعدہ افسانوں کے مجموعے بھی منصۂ شہود پر آنے لگے۔

قیام پاکستان کے بعد پشتو جدید نثر کی تمام اصناف پشتو ادب میں شامل ہوئیں اور افسانوی ادب کی مختلف اصناف جیسے ناول، ڈرامہ اور افسانہ نے بھی خوب ترقی کی مگر پشتو افسانہ کو پھر بھی خصوصی طور پر عالمی افسانوی ادب کے معیار کا ہم پلہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس دور کے نثری ادب اور خصوصی طور پر افسانوی ادب کے بارے میں پروفیسر پریشان خٹک نے درست تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے:

''اس عصر کے شروع میں یعنی پاکستان بننے کے بعد پشتو ادب اپنے تجرباتی دور سے کافی آگے نکل گیا تھا۔ کلاسیکی ادب کے سانچے چٹخ ہو گئے تھے۔ اردو اور انگریزی سے قریبی ارتباط پیدا ہو چکا تھا۔ اظہار کے نئے ذریعے نظم، افسانہ، ناول اور رپورتاژ اور نثری ادب کے دوسرے اسلوب ادب میں داخل ہو چکے تھے اور پشتو کے ادیب اپنے معاشرے کا تجزیہ کر رہے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے کے کچھ سال کش مکش اور پریشانیوں کے سال تھے۔ پشتو ادیبوں کی تمام تر توجہ قومی جنگ کی بنیادی ضرورتوں پر مرکوز تھی۔ نظم و نثر کا دائرہ محدود ہو گیا تھا اور نظم کی تمام تر توجہ تمام قوم کے جذبات کو برانگیختہ کرنے، ان کو ایک راستے پر لگانے اور آزادی حاصل کرنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ اس زمانے کی نظم، نثر اور منظوم صنفوں

میں بھی ایک جذبہ نمایاں ہے۔ قوم کی محبت سے وسیع تر انسانی محبت تک پہنچنے کے لیے جس امن و سکون کی ضرورت ہے وہ میسر نہیں تھا اور پشتو کی دنیا خصوصیت سے انگریزی کے ساتھ مسلسل برسرِ پیکار تھی۔(۲۶)

پشتو افسانے کی ترقی پسند روایت کی پاسداری اور پشتون معاشرت کے ترجمان دیگر مسائل کی روایت ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ پریشان خٹک نے ان دونوں دھاروں کی عکاسی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"افسانہ پشتو ادب میں بہت دیر سے داخل ہوا ہے اور بہت جلدی پھیلا ہے۔ پشتو کے تقریباً تمام ادیبوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس کو فروغ بخشا ہے۔ اس عصر کے ابتدائی افسانوں پر مقصدیت غالب ہے اور زیادہ تر ترقی پسند ادیبوں نے ایک خاص مقصد کے زیرِ اثر افسانے لکھے ہیں۔ معاشرتی ناہمواریوں کی تلخیاں اور طبقاتی کشمکش ان کے خاص موضوع ہیں جن کو پشتون ثقافت کی آمیزش کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ کچھ دور چل کر اس میدان پر ترقی پسندوں کی اجارہ داری قائم نہیں رہ سکی اور بہت سے ادیبوں نے ان موضوعات سے ہٹ کر معاشرے کے دوسرے تقاضوں پر بہت اچھے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ان موضوعات میں لطیف نفسیاتی نکتے، دبے ہوئے جنسی جذبات، معاشرے کی پیچیدگیاں اور فنی تقاضے سب شامل ہیں۔ اس دور کے اچھے افسانہ نگاروں میں قلندر مومند، زیتون بانو، ارباب رشید احمد، اشرف حسین احمد اور عبدالرحیم مجذوب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا اسلوب، اندازِ نظر، موضوع دوسرے سے مختلف ہے لیکن ان میں سے ہر ایک افسانے کی تکنیک پر قابو ہے اور ہر کوئی اس صنف کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ گل افضل خان کو زبان و بیان کے اعتبار سے اچھے افسانہ نگاروں میں شامل کیا جا سکتا ہے اور سیف الرحمٰن سید کے نفسیاتی تجزیے قابلِ قدر ہیں۔ باقی بہت سے ادیبوں نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں لیکن گاہے گاہے اور سرراہے اس فن کو اپنا مخصوص موضوع نہیں بنایا۔(۲۷)

اگرچہ پشتو میں افسانہ نگاری کی روایت باقاعدہ طور پر ۱۹۱۷ء سے شروع ہو چکی تھی مگر ہمارے اکثر و بیشتر ناقدین نے معیاری افسانہ نگاری کی روایت کا آغاز قیامِ پاکستان ۱۹۴۷ء کے دور کے بعد کیا قیامِ پاکستان سے پہلے بھی پشتو میں بڑے معیار کے افسانے موجود ہیں مگر یہ معیاری افسانے گنتی کے ہیں۔ اس لئے ہمارے دانشور قیامِ پاکستان کے بعد پشتو افسانے کی روایت کو خصوصی توجہ دیتے ہیں۔

پشتو اور اردو کے نامور نقاد و محقق ایوب صابر نے اپنی کتاب جدید پشتو ادب میں پشتو افسانے کے عروج کا دور ۱۹۳۸ء کے بعد متعین کیا اور چند بڑے افسانہ نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

پشتو ادب میں افسانے کا جدید دور جس میں افسانہ اپنے عروج پر ہے ۱۹۳۸ء کے بعد شروع ہوا۔ اس دور کے لکھنے والوں میں مفلس درانی، ولی محمد طوفان، مہدی شاہ مہدی، قلندر مومند، محمد لطیف وہمی، مراد خان شنواری اور یوسف خان اورکزئی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ولی محمد طوفان نے اپنے افسانوں میں جدیدیت کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ محمد لطیف وہمی نے چند افسانے لکھے مگر اپنے لئے جگہ بنا گئے۔ یوسف خان اورکزئی کی کم گوئی غزل کے علاوہ افسانے میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہتی تاہم انکا افسانہ "روٹی" پشتو کے اچھے افسانوں میں سے ایک ہے۔ مراد خان شنواری کا افسانہ "عجب خان" ایک اچھی کوشش ہے اور اس کے علاوہ ان کے کئے دیگر افسانے بھی چھپ چکے ہیں۔

مہدی شاہ مہدی نے افسانوں پر بھرپور توجہ صرف کی اور ان کے کئی افسانوی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوئے جن میں بیت (حیرت)، دیوری تال (قوس قزاح نشان) اور لالہ کولہ" (گل لالہ) شامل ہیں اور خاصی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پشتو افسانوں میں ۱۹۳۵ء کی جنگ آزادی اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک کے دور کی نقاب کشائی جن افسانوں میں کی گئی ہے۔ ان کے خالق مہدی شاہ مہدی ہیں۔ ان کے علاوہ اس موضوع پر تاثر کے اعتبار سے اچھے افسانے اجمل خٹک، ولی محمد طوفان، حمزہ شنواری اور بخش ظلیل نے بھی لکھے ہیں (۲۸)

قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانہ نے فن و تکنیک کے حوالے سے بھی ترقی کی اور موضوعات کے لحاظ سے بھی خاطر خواہ تنوع کا نمائندہ رہا۔ اس دور میں خواتین افسانہ نگاروں نے بھی بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کیا۔ پاکستان کے پرانے صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) اور صوبہ بلوچستان میں پشتو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں نے اس صنف میں اضافے کیے۔ اس سے پہلے کہ ہم صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) اور بلوچستان میں قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانے کے ارتقاء پر بحث و تبصرہ کریں، یہاں پشتو افسانے کے نامور محقق پروفیسر امیر منگل کی رائے پیش کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے پشتو افسانے کے زریں دور کو ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک متعین کیا اور لکھا ہے۔

"اگر ۱۹۳۹ء سے ۱۹۸۲ء تک لکھے گئے پشتو افسانے کا تجزیہ کیا جائے تو ان تین عشروں میں جو افسانے لکھے گئے ہیں وہ مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے کافی بہتر ہیں اور اس دور میں پشتو افسانے نے

ترقی کے مختلف مراحل طے کیے کتابوں کے بے شمار مجموعے شائع ہوئے اور پرنٹ میڈیا پر اسے کافی کوریج ملی، یہی وہ عرصہ بھی ہے جس میں ترقی پسند سوچ رکھنے والے نور محمد ترکی نے "نوی کال خوب" (نئے سال کا خواب) (۱) افسانہ لکھا موصوف ایک انقلابی سوچ رکھتے تھے انہوں نے اپنے افسانوں میں مظلوم طبقے کی بھرپور نمائندگی کی ہے جس سے پشتو افسانہ ایک نئے رنگ میں جلوہ افروز ہوتا ہے اور سلسلہ ۱۹۹۲ء تک چلتا ہے۔ اس دور میں رہبر پشاور، ننجی پشاور، الفلاح پشاور، اعلم پشاور، لار پشاور، قند مردان، افغان مردان، افغان پشاور، یاسمین کراچی و پشاور، جمہور اسلام پشاور، اولس کوئٹہ، انجام پشاور، [illegible] حرام پشاور، "پشتو پشاور" اور امن پشاور وغیرہ پشتو کے وہ مشہور روزنامے ہفت روزے اور ماہنامے ہیں جنہوں نے پشتو افسانے کی ترویج و ترقی میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۰-۱۹۴۹ء میں اولسی ادبی جرگہ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جس کی وساطت سے ترقی پسند مصنفین نے پشتو افسانے کو مزید زندگی کے قریب تر کر دیا (۲۹)

پروفیسر اسیر منگل نے اپنے ایک مقالے "پشتو افسانے کے جدید رجحانات" میں پشتو افسانے کے ارتقاء کا دور ۱۹۵۱ء کے بعد متعین کیا ہے اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کے دور کو پشتو افسانے کا عبوری دور کہا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

> ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۰ء تک پشتو افسانہ نگاری کا دور، عبوری دور کہلاتا ہے۔ اس کا رنگ اصلاحی اور رومانوی ہے، تکنیکی لحاظ سے زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ ۱۹۵۱ء میں پشتو افسانے میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی اور یہ "اولسی ادبی جرگے" کی ادبی سرگرمیوں سے ممکن ہوا۔ یہ وہ دور ہے جس میں پشتو ادب نے ترقی پسند رجحانات باقاعدگی سے اپنائے اور اس کے اثرات پشتو افسانے پر بھی پڑے۔ افسانہ نگاروں نے جدید اسلوب کو رواج دیا جس کے نتیجے میں فنی اور موضوعاتی لحاظ سے نئے رجحانات اور میلانات کو فروغ ملا۔ چونکہ افسانہ بذات خود ایک جدید صنف ہے اور ناول کے بعد ہی وجود میں آیا ہے لہٰذا اس میں جس کسی نے بھی طبع آزمائی کی ہے تو اس نے ایک جدید اسلوب فکر کے تحت ہی سماجی المیوں کو زیر بحث لانے کی سعی کی ہے جس سے پشتو افسانے میں ایک نیا باب کھل گیا ہے (۳۰)

اس پس منظر میں ہم قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانے کے سفر اور ارتقاء پر تبصرہ کرتے ہیں اور صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) اور بلوچستان میں پشتو افسانے کے فنی و فکری جہات نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے خواتین افسانہ نگاروں کو بھی خصوصی طور پر زیر بحث لایا جائے گا۔

صوبہ سرحد میں افسانہ:

آزادی کے بعد صوبہ سرحد میں پشتو افسانے کی طرف تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے طبقے نے زیادہ توجہ دی بقول قلندر مومند پشتو افسانے کا یہ شعوری دور اردو سے زیادہ مغربی افسانہ سے متاثر ہے۔ قلندر مومند کی اس رائے کی تائید رضا ہمدانی اور ڈاکٹر محمد اعظم اعظم نے بھی کی ہے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے "س دور کے افسانہ نگاروں کی نظر اردو افسانے پر بھی مرکوز رہی۔ آزادی کے بعد جن افسانہ نگاروں کے افسانے منصۂ شہود پر آئے۔ ان میں مراد شنواری، اشرف حسین احمد، نادر خان بزمی، جان محمد زلے، حسن خان سوز اور شمس الدین مظلس درانی کے نام پہلی فہرست میں آتے ہیں۔ مذکورہ افسانہ نگاروں کے افسانے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے اس دور کے بعد پشتو افسانے کے ارتقاء میں عبداللہ جان اسیر، اجمل خٹک، ایاز داؤد زے، رضا ہمدانی اور چند دیگر نے حصہ لیا۔ جنہوں نے انگریزی اور اردو فکشن کا مطالعہ کیا تھا اور پشتو افسانے کو فنی اور فکری جدتوں سے آشنا کر رہے تھے۔ جون ۱۹۵۱ء کے "اسلم" میں کاکاجی صنوبر کا افسانہ لویہ دروازہ (بڑا دروازہ) شائع ہوا۔ اگست ۱۹۵۱ء کے شمارے میں انہوں نے گورکی کا افسانہ واخلا تو سیع ترجمہ کیا جس سے کاکاجی کے افسانوی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ آزادی کے بعد افسانوں کا پہلا مجموعہ نادر خان بزمی کا "پیشی" (کریمیں) ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا جو پشتو افسانوں کا مجموعی لحاظ سے بھی پہلا مجموعہ ہے۔ نادر خان بزمی کے افسانوں میں کچھ تو راحت زاخیلی کے افسانوں کے موضوعات کے اثرات، دیہاتی ماحول اور معاشرتی رنگ نمایاں ہیں اور کچھ ماسٹر عبدالکریم کی طرح ترقی پسند عناصر کے نمائندہ افسانے بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے افسانے فنی اور تکنیکی حوالے سے بھی معیاری ہیں۔

آزادی کے بعد سب سے بڑے اور سربرآوردہ افسانہ نگار مہدی شاہ مہدی پشتو افسانوی ادب کے میدان میں نمودار ہوئے۔ ان کے افسانوی مجموعے "نختان" "زہوزی دل" (قوس قزح)، پت (غیرت) اور لالا گلونہ" (گل لالہ) 1956ء سے لے کر 1969ء تک شائع ہوئے۔ ان سب افسانوں کا مجموعہ "دمہدی داستانی کلیات" (کلیات) افغانستان میں شائع ہوا ہے۔ ان کا آخری مجموعہ "دقیامت نخہ" (قیامت کی نشانی ہے) جو 1996ء میں شائع ہوا ہے۔ میر مہدی شاہ مہدی کے افسانے موضوعاتی حوالے سے سیاسی رنگ لئے ہوئے ہیں اور عموماً خدائی خدمتگار تحریک کے مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تکنیک کے حوالے سے مہدی شاہ مرحوم خود بھی کہتے تھے کہ وہ افسانہ کے بنیادی

لوازمات سے زیادہ وہ موضوع کی اہمیت اور مقصدیت پر توجہ دیتے ہیں۔ مہدی شاہ مہدی افسانہ لکھنے کی ابتداء اور اس صنف کی طرف توجہ ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"بچپن ہی سے مجھے قصہ سننے کا شوق تھا۔ میں نے اپنے گاؤں تنگول کے ایک سکول میں جب پہلی بار حمزہ شنواری کا ایک افسانہ پڑھا تو مجھے لگا کہ میں بھی ایسے قصے لکھ سکتا ہوں۔ یوں میں نے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ میں فنی لوازمات پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ اس دور میں ترقی پسند ادیب مظلوموں کی داد رسی کے لئے افسانے لکھتے تھے۔ اجمل خٹک صاحب نے ایک افسانہ "وروجنڈئی" (دو بیرغ) تنقید کے لئے پیش کیا تھا۔ اگر چہ اب اس افسانہ میں مجھے کئی فنی خامیاں نظر آتی ہیں لیکن مجھے اس افسانہ نے بھی بہت متاثر کیا تھا۔ اس زمانے میں خدائی خدمتگار تحریک سے وابستہ لوگ انگریزوں کے ظلم کے شکار تھے لہذا ہم نے پر ظلم اور مظلومیت اپنے افسانوں کا مرکزی موضوع بنایا۔

میں نے اس دور میں بھی افسانے لکھے جب ون یونٹ کا مسئلہ ہمارے سامنے تھا، مارشل لاء لگا ہوا تھا، پشتون ظلم اور جبر کے شکار تھے۔ قوم پرستوں نے اس دور میں میرے افسانوں کو بہت سراہا اور ساتھ ہی اولسی ادبی جرگہ سے وابستہ ناقدین حمزہ شنواری، دوست محمد کامل اور قلندر مومند نے میری حوصلہ افزائی کی۔ قلندر مومند نے میری پہلی کتاب کا دیباچہ لکھتے وقت مجھے افسانے کا بابا آدم کہا تھا(۳)

مہدی شاہ مہدی کے افسانوں کے بارے میں امیر حمزہ شنواری نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔
اکثر و بیشتر ناقدین نے ان کے افسانوں میں مقصدیت اور بہت دلکش کردار نگاری کے حوالے سے بات کی ہے۔

ترقی پسند افسانہ:

افسانہ میں ترقی پسند عناصر کو جو بنیاد اجمل خٹک، ماسٹر عبدالکریم اور مہدی شاہ مہدی نے دے رکھی تھی اس کی پاسداری بعد میں کئی افسانہ نگاروں نے کی۔ جن میں ولی محمد طوفان، ارباب رشید احمد خان، قلندر مومند، مفلس درانی، ہمیش خلیل، گل افضل خان اور زیتون بانو کا نام خصوصی حوالہ بنتا ہے۔
ارباب رشید احمد خان وہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے موضوع و مقصدیت کے ساتھ ساتھ پشتو افسانے کو فنی اور مجموعی تاثر کے حوالے سے بھی بام عروج تک پہنچایا۔ راحت زاخیلی کے بعد پشتو افسانے کا سب سے بڑا نمائندہ اور اہم نام ارباب رشید احمد خان ہی کا ہے۔ اُن کے اکلوتے مجموعے "انگازے" (صدائے

بازگشت) میں کل اکیس افسانے ہیں جن میں "پند" (نصیحت) "اوجڑ ے والوٹے" (اور خیر اڑ گئے) "درے کا خزانے" (تین پتھر) جنگ، علاج، رباتی اور خکیالی جیسے شاہکار افسانے شامل ہیں۔

ارباب رشید نے بڑی مہارت سے ترقی پسند عناصر کو دیکھتے ہوئے غریب، کسان اور مزدور و مظلوم طبقے کے مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ انہوں نے فن و تکنیک پر نظر رکھتے ہوئے ترقی پسندی کا ناطہ پشتون معاشرے کے ساتھ جوڑا۔ ان کے افسانے خاص پشتون رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن عالمی انسانی مظلومیت بھی ان کی نظر میں ہے۔ ارباب رشید مجموعی لحاظ سے پشتو افسانے کا وہ نام ہے جو فن و معیار اور مختصر ترین افسانے (Short Story) کے لئے ہمیشہ زندہ رہے گا

ارباب رشید احمد کے افسانوں کے بارے میں ایوب صابر کا تبصرہ یوں ہے۔

"ارباب رشید احمد پشتو کے ایک ذہین افسانہ نگار ہیں وہ اپنے افسانوں میں جہاں نفسیاتی گتھیاں سلجھاتے ہیں وہاں کشمکش بھی اجاگر کرتے ہیں جو ہر انسان کے اندر کے آدمی اور باہر کے آدمی کے درمیان روز ازل سے جاری ہے۔ ایک بالغ نظر انسان کے شعوری احساسات و مشاہدات کا اثر جب اس کے شعور پر پڑتا ہے تو اس کے اندر کا آدمی خود بخود باہر آتا ہے۔ ارباب رشید احمد کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ تمام پاکھنڈ انہوں نے اپنی innerself کو باہر لانے کے لئے ہی رچایا ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں۔ ان کے یہ تمام افسانے سرحد کی دیہی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں اور ان میں قدرتی مطابقت بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ارباب رشید احمد کے بعض قارئین شاکی ہیں کہ انہوں نے بھی بعض دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح پشتو افسانے کو جنسی لذتیت سے داغدار کر دیا ہے۔ میں اس الزام کی تردید کرتا ہوں ان کے افسانے جنسی لذتیت سے پاک ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک افسانے "حشر" کو ہی لے لیجئے اس افسانے کا مرکزی کردار ایک سیدھا سادا دہقان ہے اور ایک روز منہ اندھیرے اپنے کھیتوں میں ہل جوتنے کے لئے نکلتا ہے تو اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس کی شلوار پہن کر نکلا ہے۔ بعد میں جب سورج طلوع ہوتا ہے۔ روشنی پھیلتی ہے اور کھیتوں میں دہقانوں کی نگاہیں اس کی شلوار کے گلدار پائچوں پر پڑتی ہیں تو ان کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور وہ کام کاج چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر جب وہ خود بھی اپنی شلوار کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو شرمسار ہو جاتا ہے۔ شلوار کی اس تبدیلی اور شرمساری کے اس احساس میں جنسی لذتیت کہیں بھی نہیں ویسے اگر کوئی خواہ مخواہ اس تفصیل میں جائے تو

یہ شلوار کی تبدیلی کیسے عمل میں آئی اور خدا جانے اس تبدیلی سے پہلے کیا کیا کچھ ہو گیا ہوگا تو بات جنسی لذتیت سے بھی آگے بڑھ کر سیدھی فحاشی تک پہنچ جائے گی۔ جس کے لئے ہم مصنف کو ملعون نہیں کر سکتے۔ یہ قصور تو اس قاری کا ہوگا جو تجریدیت میں لذت تلاش کرنے کے لئے تصور کی دنیا آباد کرتا ہے اور وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچنا کچھ ایسا ضروری نہیں ہے یا اگر ضروری ہے تو اس کی تشہیر کرنا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ یہ دراصل:

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

والا معاملہ ہے اگر خود قاری کا ذہن صاف نہ ہو تو اس کو ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اپنے اندر کی غلاظتیں افسانہ نگار کے سر تھوپتا پھرے اور اس کو سنگسار کرتا پھرے (۳۲)

اسی انداز کے دیگر افسانہ نگاروں میں قلندر مومند، گل افضل خان، ہمیش خلیل کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ قلندر مومند کا ایک ہی افسانوی مجموعہ ہے جو "گجرے" (چوڑیاں) کے نام سے 1958ء میں چھپا ہے۔ ہمیش خلیل کا مجموعہ "چارگل" کے نام سے 1973ء میں چھپا اور گل افضل خان کے دو مجموعے "گلے لارے" اور "واخوٹ" بھی اسی دور میں شائع ہوئے۔ تینوں کے موضوعات ترقی پسند ہیں اور یہ افسانے تکنیک کے حوالے سے بہت پختہ اور معیاری ہیں۔ قلندر مومند کا افسانہ "گجرے" ہمیش خلیل کا "ڈیوہ مړ شو" (دیا بجھ گیا) اور گل افضل خان کا ڈولئ (ڈولی) ترقی پسند روایت کے نمائندہ افسانے ہیں۔

قلندر مومند کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایوب صابر انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ لکھتے ہیں:

"قلندر مومند کے افسانوں کا ذکر کرنے سے پہلے اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ افسانے کی جدید ترین تکنیک اور موضوعات ابتدا میں پشتون افسانہ نگاروں کے لئے نامانوس تھے اور ان کو مانوس کرانے میں سب سے گہرا ہاتھ قلندر مومند کا ہے۔ وہ پشتو کے ایک کثیر المطالعہ فن کار ہیں اور اردو اور انگریزی افسانوی ادب سے براہ راست استفادہ کرتے رہے ہیں۔ ان کی طبیعت میں تلاش و تحقیق کے جذبے کے ساتھ تخلیقی جوہر بھی موجود ہیں۔ وہ حساس پشتونوں کی غیرت، غیور انسانوں کی تذلیل، نڈر اور سرکش نوجوان کی مظلومیت، جفاکش اور تنومند پشتونوں کی بھوک اور برہنگی محنت کش کسانوں کی فاقہ کشی اور بے چارگی سے متاثر ہو کر جب قلم اٹھاتے ہیں اور اپنے کسی افسانے کا سلسلہ پھیلاتے ہیں تو

فن کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں کے موضوعات اور ان موضوعات کی تہہ میں محرک جذبہ اکثر معاشی ناہمواریاں، ان سے پیدا ہونے والی معاشرتی خرابیاں اور نچلے طبقے کی حمایت میں جہاد کر رہا ہے۔ یہ تمام افسانے اسی ماحول سے متعلق ہیں جن میں وہ خود زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ اچھوتے مگر روزانہ زندگی کے اصلی عکس ہوتے ہیں۔ وہ افسانے میں زندگی پیدا کرنے کی ایسی جگہ بناتے ہیں جس میں افسانہ نگار خود بھی ایک کردار کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک افسانہ "اباسین نہ تر کابلہ پورے" (دریائے سندھ کابل تک) پیش کیا جا سکتا ہے جو ان کے افسانوں کے مجموعے "بنگڑے" (چوڑیاں) میں شامل نہیں ہے۔ ان کے افسانوں میں کہیں کہیں نفسیاتی رنگ بھی غالب نظر آتا ہے جیسے ایک افسانہ "لرگے" (لکڑی) میں ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے پشتونوں کے عوامی معاشرے کی خرابیوں کی بھی عکاسی کی ہے۔ جیسا کہ افسانے "شرم" میں موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں دیگر خوبیوں کے علاوہ بنیادی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر افسانے کے نقطہ عروج پر پہنچ کر خود الگ ہو جاتے ہیں اور قاری کو اس سوچ میں گھلنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کے آگے کیا ہے پھر یہ کام قاری کا ہے کہ وہ اپنی بساط کے مطابق آگے بڑھے اور افسانے کے اختتام کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرے۔ اس اعتبار سے قلندر مومند پشتو کا وہ واحد افسانہ نگار ہے جو افسانے کی جدید ترین تکنیک کے مطابق لکھ رہا ہے اور اس اعتبار سے ان کے افسانوں کا مجموعہ بنگڑے پشتو کے افسانوی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔(۳۳)

مفلس درانی اور زیتون بانو اگرچہ قلندر مومند، ہمیش خلیل اور گل افضل خان سے پیشتر افسانہ نگار ہیں لیکن مفلس درانی ترقی پسند ہوتے ہوئے اپنی شناخت بنانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے اور زیتون بانو کے افسانوں میں ترقی پسندی سے زیادہ خواتین کی نفسیات، پشتون عورت کے مسائل اور جنسی میلانات کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ زیتون بانو کا پہلا افسانوی مجموعہ "ہندارہ" (آئینہ) 1958ء میں چھپا۔ اس کے بعد تین اور مجموعے "مات بنگڑی" (ٹوٹی ہوئی چوڑیاں)، ژوندی غمونہ (زندہ دکھ) اور خوبونہ (خواب) شائع ہوئے۔ دو اور مجموعے ابھی زیر طبع ہیں۔ مفلس درانی کا مجموعہ "دسرو غاښ" سونے کے دانت 1995ء میں ڈاکٹر شیر زمان طائزی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ مفلس نے وضاحت کی ہے کہ ان کا پہلا افسانہ رقاصہ 1945ء میں اخبار "افغان" میں شائع ہوا تھا لیکن اب دستیاب نہیں ہے۔ دستیاب افسانوں میں جو اس مجموعے میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا افسانہ

''راشہ'' (پیداواری فصل) 1948ء میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ طبقاتی موضوع پر ہے۔ پشتون معاشرے میں خان اور کسان طبقے کی کشمکش اور کسان طبقے کی محنت اور محنت کشوں کے استحصال کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے کے علاوہ چند اور افسانے ترقی پسند فکر کے غماز ہیں۔ ''دوخوجنڈ'' سیاسی اور ''وارث'' معاشرتی افسانہ ہے۔ مفلس صاحب کے افسانے پشتو فکشن میں منفرد اضافہ ہیں۔ قمر راہی قمر کا مجموعہ ''پلوشے'' پوری طرح ترقی پسند افسانے کی نمائندگی کرتا ہے۔

''پشتو کے جدید افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے حسن خان سوز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مردان کی مردم خیز سرزمین سے ابھرے ہوئے اس فن کار نے پشتو کے افسانوی ادب میں قابل قدر اضافے کیے ہیں اور اردو کے جدید ترین دور کے اونچے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں پشتو کے جن افسانہ نگاروں کو پیش کیا جا سکتا ہے ان میں حسن خان سوز کو بھی شامل کرنا پڑتا ہے۔ حسن خان سوز نے اب تک ساٹھ ستر کے قریب افسانے لکھے ہیں مگر ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ تا حال نہیں چھپا۔

پشتو کے دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح حسن خان سوز بھی اپنے افسانوں میں طبقاتی کشمکش کو اجاگر کرتے ہیں اور ایک ایسے معاشرے کی تمنا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس میں اونچ نیچ اور تفریق نہ ہو۔ وہ مساوات کے قائل اور مزدوروں کے ہمدرد ہیں اور نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ عملی طور پر بھی مزدوروں کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔ وہ جاگیرداروں اور جاگیرداری کے خلاف شریفانہ جدوجہد کے قائل ہیں اور خدا جانے یہ حسن خان سوز کی خوبی ہے یا عیب کہ وہ ''پشتون آنسو''، ''پشتون آنکھیں'' اور ''پشتون غیرت'' جیسی ادبی اصطلاحوں کے قائل نہیں، وہ کہتے ہیں اس قسم کی اصطلاحیں پشتونوں کو فاشزم کی طرف لے جا رہی ہیں اور ہر باشعور آدمی کا یہ فرض ہے کہ وہ فاشزم کے رجحان کی مخالفت کرے۔ اس سلسلے میں ان کے پاس اگر کوئی دلیل ہے تو یہ کہ جرمنی محض اس لئے تباہ ہوا کہ ہٹلر نے جرمن قوم کو دنیا کی تمام قوموں سے بلند سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اب اگر پشتونوں میں کوئی ہٹلر پیدا ہوا تو یہ قوم بھی مٹ جائے گی (۳۳)

جمال رازی کے دو افسانوی مجموعے ''کٹ'' (چارپائی) اور ''پنځه کورنی'' (پانچ خاندان) کے اکثر افسانے ترقی پسند موضوعات کی غمازی کرتے ہیں۔

اشرف حسین احمد کے مجموعے ''شیرین گل'' اور ''سورے شیشے'' (دونوں کرداروں کے نام ہیں)، ہدایت اللہ فلک کا ''لوری لمبی'' (اور شعلے) سعد اللہ جان برق کا ''د کشمیر غازی'' (کشمیر کا غازی)،

صاحب شاہ صابر کا "وادی اولگونہ" (برف اور پھول)، عبدالکافی ادیب کا "کا گرگونہ" (تیز سے چہرے) اور تمند خرے (پیاسا)، قیوم مروت کا "پت مخونہ" (چھپے چہرے)، عنایت اللہ ضیاء کا "مارگیری سیوری" (عصر کے وقت سائے) ڈاکٹر شیر زمان طائزی کا "شپیلی" (بانسری) اور رشو (چراگاہ) خالقداد امید کا "دنیا وبت" (چوں کی بستی) سلمیٰ شاہین کا "کانی اوازغی" (پتھر اور کانٹے)، خورشید اقبال خٹک کا "دکانی اوراوشکی" (پتھر کے آنسو)، لائق شاہ درپہ خیل کا "توپی توپی بپی" (توپی دریا کی لہریں)، نور الامین یوسفزئی کا "ژړی ولی" (اندر سے خالی درخت) اور "داسونو پاچاہی" (گھوڑوں کی بادشاہت) پشتو افسانوں کے متفرق مجموعے ہیں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں۔ یہ تمام اس نے مختلف قسم کی سماجی، سیاسی، ثقافتی اور دیگر متفرق موضوعات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

فنی تجربے

اس دور میں صوبہ سرحد کے افسانہ نگاروں میں چند نام ایسے آئے جنہوں نے پشتو افسانے کو فنی اور فکری لحاظ سے نئی جہت دی۔ طاہر آفریدی، عنایت اللہ ضیاء، اور سید حسین گل نے پشتو افسانے میں نئے نئے تجربے کئی اور الطاف خٹک نے افسانے کے اس معیار کو شادابی کا رنگ دیا جو گل افضل خان، قلندر مومند اور ہمیش خلیل نے قائم کیا تھا۔

طاہر آفریدی اس دور کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز حیثیت اختیار کر گئے۔ ان کا پہلا مجموعہ "گلونو خاوے" (گلوں کے سائے تلے) 1971ء میں شائع ہوا جس کے بعد وہ مسلسل افسانے لکھتے رہے یہاں تک کہ افسانہ طاہر آفریدی کا خصوصی حوالہ بن گیا۔ اب آپ کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ پانڑے پانڑ (پتے ہی پتے)
۲۔ لارہ کښې ماښام (رستے میں شام)
۳۔ بیا طغه ما شام دے (پھر وہ شام آ گئی)
۴۔ نور خوبونه نه وینم (اور خواب نہیں دیکھوں گا)
۵۔ په زنجیر تړلے خوب (زنجیروں میں جکڑا خواب)

طاہر صاحب کے پہلے مجموعے کے افسانوں میں ترقی پسند رنگ اور طبقاتی مسائل کی جھلک

نظر آتی ہے لیکن بعد کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع کا رنگ جھلکتا ہے۔ انہوں نے افسانے میں دیہاتی ماحول و معاشرت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کی عکاسی بھی کی ہے اور ان پشتونوں کے مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے جو گاؤں سے شہر کی طرف رخ کرتے ہیں اور پھر شہری ثقافت میں ضم ہو جاتے ہیں۔ آخری دور کے افسانوں میں سیاسی موضوعات خصوصی طور پر افغانستان کے سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ فنی لحاظ سے اگرچہ شیر زمان طائزی نے مطلس درانی کے افسانوں میں چندو کو علامتی قرار دیا ہے لیکن پشتو افسانے میں علامتی انداز کو رواج دینے میں سب سے نمایاں نام طاہر آفریدی کا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ علامتی انداز کے اثرات فرانس اور انگلینڈ کے فکشن سے اردو ادب میں آئے تھے اور اردو فکشن میں بھی بری طرح یہ تجربات ناکام ہوئے لیکن پشتو افسانے میں علامتی انداز کو رواج دینے میں سب سے نمایاں نام طاہر آفریدی کا ہے۔ ہمارے پشتون افسانہ نگار پھر بھی علامتی تجربے کرتے رہے۔ طاہر آفریدی اب تک لکھ رہے ہیں، اُن کے شانہ بشانہ عنایت اللہ ضیاء بھی فنی تجربوں میں مصروف رہے "بازیگری سپوږمۍ" کے بعد اُن کے افسانوں کا مجموعہ "تال" (جھولا) اور "لیمہ نے پہ شیشو کې کړ" (دیوانہ شیشوں میں) شائع ہوئے۔ ضیاء کے افسانے مقصدی ہیں لیکن انداز علامتی اور تجریدی ہے۔ ہمارے پشتون ناقدین نے ضیاء کے افسانوں کو ابھی تک مکمل افسانے تسلیم بھی نہیں کیا لیکن ضیاء ناقدین کی آراء سے بے پرواہ ہو کر اسی انداز میں افسانہ لکھ رہے ہیں۔ البتہ انہوں نے اپنے تیسرے مجموعے کو افسانہ کہنے کی بجائے خود بھی "تکیہ" کا نام دیا ہے۔ حسینہ گل کے افسانے رواں اور سلیس انداز میں ہیں لیکن موضوع کے حوالے سے وہ بہت جرات اور آزادی فکر کا مظاہرہ کر رہی ہیں یہاں تک کہ جنس کے موضوع پر بھی جرات اظہار کے ساتھ لکھ رہی ہیں۔

الطاف خٹک کا مجموعہ "حق چې جنت دی" (اگر جنت چلیں) ایک مکمل اور معیاری افسانہ کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ وہ کسی قسم کی علامت و تجرید کے قائل نہیں البتہ زبان کی صفائی، مکالماتی تکنیک اور خصوصی طور پر کردار نگاری کے حوالے سے الطاف خٹک کے افسانے اپنی مثال آپ ہیں۔ موضوع کے حوالے سے وہ ترقی پسند عناصر کو اپنے پشتون معاشرے سے جوڑ کر فطری انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ اُن کے افسانے طویل ہیں اور تاثر کے لحاظ سے انتہائی جاذب و دلکش ہیں۔ اُن کے افسانوں کے بارے میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ افسانہ اپنے حقیقی رنگ میں راحت زاخیلی کے بعد گل افضل خان، ہمیش خلیل، قلندر مومند، ماہ باب، رشید احمد خان اور زیتون بانو نے پیش کیا تھا اور ہماری جدید پود کے

افسانہ نویسوں میں اس رنگ کو الطاف خٹک نے پیش کر کے پشتو افسانے کے فطری رنگ کا احیاء کیا۔

صوبہ سرحد کے دیگر متفرق افسانہ نگاروں میں سید تقویم الحق کاکاخیل، روخ لیونے، سیف الرحمن سید، اکمل اسد آبادی، عبداللہ جان معصوم، پیر محمد شارق، غازی سیال، نورالبشر نوید، محمد اقبال، میاں اسرار گل، پائین شیل، افضل دین خٹک، طاہر بخاری، محمد اعظم، سحر یوسفزئی، سردار خان فنا، اسیر منگل، ممتاز قاضی، محمد ایاز زئی، محمد ایاز عزل، اسمٰعیل گوہر، علی زر خان گگری، اختر حیات قمر، نثار محمد خان اور کئی دوسرے شامل ہیں۔

پشتو افسانے کا سب سے بڑا مرکز خیبر پختونخوا ہی رہا ہے۔ یہیں سے پشتو افسانے نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔ یہیں پروان چڑھا ہے اور پختونخوا ہی میں فن، تکنیک اور موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے عروج تک پہنچا ہے۔

خیبر پختونخوا کے ساتھ ساتھ پشتو میں افسانہ افغانستان میں بھی لکھا جا رہا تھا اور بلوچستان میں بھی کئی افسانہ نگار افسانے لکھتے رہے۔ چونکہ ہمارا موضوع قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانے کا سفر اور ارتقا ہے لہذا یہاں ہم افغانستان میں لکھے گئے پشتو افسانے سے قطع نظر کر کے بلوچستان میں قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانے کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی مجموعی طور پر خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مختصر جائزہ بھی پیش کریں گے جس میں فنی اور فکری دونوں حوالوں سے مختلف افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کے حوالے بھی شامل ہوں گے۔

بلوچستان

بلوچستان میں افسانہ نویسی کے حوالے سے در محمد کاسی، مرزا خان ہیچی، محمد نسیم ستانیزی اور فاروق سرور کے نام ابتدائی فہرست میں آتے ہیں۔ ان میں فاروق سرور تسلسل سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ پہلا مجموعہ دریہ (دف) کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد تین مجموعے "تندہ" (پیاس)، "لیوہ" (بھیڑیا) اور "مرغئی کیوکہ" (پرندے کا نام ہے) کے نام سے منظر عام پر آئے۔ فاروق کے افسانوں میں علامتی رنگ نمایاں ہے جو اردو افسانے میں کب کا مسترد کیا جا چکا ہے۔ مرزا خان ہیچی کا مجموعہ غرہ لمن (پہاڑ کا دامن) مارچ 1992ء میں پشتو ادبی ملگری لورالائی کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ چند نوجوان افسانہ نگار بھی اس صنف میں اضافہ کر رہے ہیں۔ بلوچستان میں پشتو افسانہ کے بارے میں

کمیل قزلباش لکھتے ہیں۔

''پشتو میں افسانہ مجموعی طور پر بیسویں صدی میں داخل ہوا، لیکن بلوچستان میں اس طرف بہت بعد میں توجہ ہوئی۔ ستر کی دہائی کے بعد کبھی کبھار کوئی شاعر ایک آدھ افسانہ لکھ لیتا تھا اور پھر اپنی شاعری کی طرف متوجہ ہوتا۔ لیکن باقاعدہ طور پر اسی کی دہائی کے بعد چند نام منظر عام پر آئے ہیں جن میں درمحمد کاسی، حاجی مرزا خان، فاروق سرور، ولی محمد ولی کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ درمحمد کاسی کے تین افسانوی مجموعے ہیں، جن کا انداز واقعہ نگار جیسا ہے۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ حاجی مرزا خان "پٹی" کی ایک کتاب چھپی ہے، ان کے افسانوں میں پشتون کلچر کے ماحول کی عکاسی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے خواتین کے مسائل پر زیادہ تر افسانے لکھے ہیں۔ فاروق سرور کے تین افسانوی مجموعے چھپے ہیں، ان کا انداز بلوچستان میں نمایاں ہے، فاروق نے علامتی افسانے بھی لکھے ہیں۔ ولی محمد ولی کا انداز عامیانہ ہے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ چھپا ہے اس کے علاوہ نظر یا تیزئی اور مقدس خان معصوم بھی افسانے لکھتے ہیں۔ نظر میں شاعری کی نسبت افسانے کی حس قوی ہے۔ نئے ناموں میں محمود ایاز کوشش کر رہے ہیں، عقیل باور نے اچھے افسانے لکھے ہیں، علی کمیل قزلباش نے زیادہ تر علامتی افسانے لکھے ہیں اور افسانچے یا مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ جبکہ ناظر صادق، نصیب اللہ سیماب افسانے لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے نام ہیں جنہوں نے ایک آدھ افسانہ لکھا ہے۔(۳۵)

پشتو افسانے کے اس مختصر سفر کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اردو فکشن کی طرح پشتو میں اس صنف نے فنی و فکری لحاظ سے زیادہ ترقی نہیں کی مگر پھر بھی چند افسانہ نگاروں، خصوصی طور پر راحت زاخیلی، ارباب رشید احمد خان، گل افضل خان خٹک، دوست محمد، ہمیش خلیل، طاہر آفریدی اور زیتون بانو کے افسانے فن و تکنیک اور تاثر کے لحاظ سے مشرق کے فکشن میں ہم معیار کے لحاظ سے پیش کر سکتے ہیں ہیں۔ میری نظر میں بیگم منور روؤف کا یہ مجموعی تبصرہ پشتو افسانے کے بارے میں درست ہے جس میں وہ لکھتی ہیں:

''پشتو ادب میں نثر کا حصہ کم ہے، لیکن جدید دور کے آغاز کے ساتھ اس صنف ادب پر توجہ دی گئی۔ اب نثر میں باقاعدگی سے کام جاری ہے۔ ابتدائی دور کے افسانوں میں پشتو ثقافت اور اقدار کی ترجمانی کے علاوہ روایات پر تنقید کی گئی ہے۔ جن کے آثار آج کے افسانوں میں بھی نظر آتے ہیں۔

آزادی کے بعد پشتو افسانے کو خصوصی توجہ کا مرکز بنایا گیا۔ اہلِ قلم نے افسانے کو نئے دور کے ساتھ نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کیں۔ تاہم پشتو افسانے کی بنیاد اور بہت پشتون معاشرے کے رسم و رواج، نسلی روایات اور قومی نفسیات پر قائم ہیں۔ پشتون اہلِ قلم نے اپنے معاشرے کے ان رسم و رواج کے خلاف احتجاج کیا جو انسانی شرف کے چہرے کو مسخ کرتے ہیں اور غیر انسانی اور فرسودہ روایات کو روا رکھتے ہیں۔ ان پر افسانوں کے ذریعے بے باک تنقید کر کے اپنی انسان دوستی اور باشعور ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ گھریلو مسائل، حادثات، خواتین کو مویشیوں کی طرح مال و زر کے عوض منڈی میں گھسیٹنا، قبائلی رقابت، صدیوں پرانی دشمنیوں کے بجیثیت انسانوں کو تہ جانا، خان، زمیندار، مزدور اور مزارع کے انسانی وقار کو مجروح کرنا، غرض یہ کہ معاشرتی زندگی میں پیدا ہونے والے ان مسائل پر قلم اٹھایا اور ایسے ہی المیوں کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا۔

پشتو افسانے عام طور پر بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ علامتی اور تجریدی افسانے کا وجود آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ پاکستان کی دوسری زبانوں کے افسانوں میں جو نت نئے تجربے کیے گئے ان کے اثرات پشتو افسانے پر کم دکھائی دیتے ہیں تاہم چند افسانہ نگاروں نے نیا لہجہ اور علامتی طرز اختیار کیا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ پشتو افسانے میں کہانی نمایاں ہے۔(۳۶)

خواتین افسانہ نگار

پشتو کی خواتین افسانہ نگاروں میں زیتون بانو کے علاوہ سیدہ بشریٰ بیگم (س، ب، ب)، مبارک سلطانہ شمیم، سیدہ وقا خلد شہلا، رفعت پروین، سلمیٰ شاہین، سیدہ ثروت جہاں کوکب، سیدہ رفعت نذیر، عصمت بی بی اور سیدہ حسینہ گل کے نام نمایاں ہیں۔

چونکہ زیتون بانو اور سیدہ حسینہ گل پشتو افسانے میں نئے رجحانات کو متعارف کروانے میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں اس لئے افسانے کی ارتقائی صورتِ حال میں بھی پہلے ان کا تذکرہ ہو چکا ہے لیکن یہاں بشمول دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے ان کا تذکرہ ایک بار پھر کیا جاتا ہے۔ زیتون بانو کے افسانوں کے بارے میں ہمارے عصر کے چند دانشوروں کی آراء یہ ہیں:

جناب احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

"زیتون بانو صاحبہ کے پشتو افسانوں کے اردو تراجم کا مجموعہ "شیشم کا پتا" ایک ملک گیر

حیثیت کا مجموعہ ہے، جس سے ہر زبان کے افسانہ نگاروں نے روشنی حاصل کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سرحد کی معاشرت کی جو عکاسی اور نمائندگی زیتون بانو صاحبہ نے کی ہے وہ فکشن کی دنیا میں قطعی طور پر منفرد ہے(۳۷)

جیلانی کامران لکھتے ہیں:

''زیتون بانو کے افسانے کائنات پر پھیلے انسانی دکھ کی روداد سناتے ہیں۔ وہ دکھ کو محدود معنوں میں استعمال نہیں کرتیں۔ بلکہ دکھ ان کے نزدیک ایک ہمہ گیر علامت بنتا ہے اور جب وہ یہ علامت لکھتی ہے تو اپنے دامن میں پشتو عورت کی پوری تہذیبی، اخلاقی، سماجی، نفسیاتی، بے چارگی اور پشتو معاشرہ کے مخصوص رسم و رواج کی ایک مکمل کہانی بنتی چلی جاتی ہے۔ افسانہ ''زندہ دکھ'' بھی زیتون بانو کے فکری سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے معاشرتی دکھ کا اظہار ہے جو نسل در نسل سفر کر کے ہم تک پہنچتا ہے۔ کردار مخصوص پشتون معاشرے کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ روایتی دشمنی ان کے ذہنی رجحان اور رویے کی سمت متعین کرتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ افسانہ نئے اور پرانے معاشرے کے ٹکراؤ کا افسانہ ہے کہ پہلے قاتل سے انتقام نہ لینا بزدلی سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج باپ کے قاتل کو مارنا بزدلی کی علامت بنتا ہے۔ یہ ایک خوبصورت افسانہ ہے جو سادہ اسلوب اور خوبصورت تحریر میں ہمارے سامنے موجود ہے اور زیتون بانو کے فکری زاویوں اور مخصوص انداز کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے(۳۸)

''افسانہ لکھنا میرا دیرینہ مشغلہ ہے۔ یہاں لفظ مشغلہ عام فرنگی معنوں میں، میں نے استعمال نہیں کیا، بلکہ اس سے مراد ایک مشن ہے جسے میں نے لڑکپن سے اختیار کر رکھا ہے اور اس کو ایک مشن ہی کے درجے تک پہنچانے کا عزم رکھتی ہوں۔ بعض لوگ فیشن کے طور پر انجام دیتے ہیں۔ میں نے افسانہ نگاری اسی مقصد کے تحت اختیار کی ہے اور اسے اسی صورت میں جاری رکھنے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ اس لئے میری صنف کے لوگ ابھی تک جبریت کا شکار ہیں اور مرد عورت کی قدم قدم پر تحقیر کرتا ہے۔ جس وقت مرد عورت کی تحقیر کرنا چھوڑ دے گا اس وقت میرا یہ مشن پورا ہو جائے گا(۳۹)

دیگر خواتین افسانہ نگاروں میں سید بشریٰ بیگم کے چند افسانے روزنامہ بانگ حرم اور افغان اخبار میں اس دور میں شائع ہوئے ہیں جب پشتو معاشرے میں خواتین ایک لکھاری کی حیثیت سے اپنا نام بھی ظاہر نہیں کر سکتی تھیں۔ یہی وہ بات تھی کہ سید بشریٰ بیگم ''س ب'' کے قلمی نام سے لکھا کرتی تھی۔

بیگم منور رؤف نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"سیدہ بشریٰ بیگم نے مضامین کے علاوہ متعدد افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "پہ قائم جہاں آراء" (نامراد جہاں آرا) کے عنوان سے 1939ء میں بمبئی کے ایک اخبار افغان میں چھپا۔ 1941ء سے وہ باقاعدہ طور پر پانگ حرم رسالے کے لئے کہانیاں اور افسانے لکھتی رہیں۔ ان کے افسانوں کا موضوع انسانی اخوت، محبت اور ہمدردی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم نسواں اور اصلاح و اخلاق کے موضوعات بھی ان کی توجہ اور تحریر کی پہچان ہیں۔ پشتون خواتین کے مسائل پر بھی موثر انداز میں کہانیاں لکھتی رہیں۔ سیدہ بشریٰ بیگم ایک نہایت محب وطن خاتون تھیں (۲۰)

مبارک سلطانہ شمیم کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بیگم منور رؤف نے لکھا ہے:

"مبارک سلطانہ شمیم پشتو کی اہل قلم خواتین میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ یہ ایک حساس فن کارہ ہیں۔ انہوں نے پشتو میں بڑے عمدہ افسانے تخلیق کیے ہیں۔ عام طور پر ان کے افسانوں کے موضوعات ان کی ہمدردی اور اصلاح معاشرے پر مشتمل ہیں جن میں خاص طور پر خواتین کے مسائل پر اظہار کیا گیا ہے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ "توے سحر" (نئی صبح) کے عنوان سے 1958ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں ایک ڈرامہ، پانچ مضامین اور سات افسانے شامل ہیں۔ سات افسانوں کے نام یہ ہیں۔ دتھر کور (اندھیرا گھر)، د غربتئ دنیا (غربت کی دنیا)، شپیلئ (بانسری)، ماں (معافی)، د شہو گلونہ (گل شبو)، قسمت، تورہ وریځ (کالا بادل) وغیرہ۔ ان میں تورہ وریځ ایک بہترین افسانہ ہے جس میں موجودہ وقت کے رومان پسند نوجوان پر زبردست طنز کی گئی ہے (۲۱)

سلمیٰ شاہین کے افسانوں پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتی ہیں:

"ان کے افسانے اپنے معاشرے کے عکاس ہیں جن میں سرحد کی روایات، رومان، غربت، جہالت اور خواتین کے مسائل جیسے موضوعات کو کہانی کا روپ دیا ہے۔ سلمیٰ نے بعض افسانوں میں دیہی ماحول کو حسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔ سلمیٰ کے افسانوں میں روایت اور جدیدیت کا امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے رومانی افسانوں کے علاوہ علامتی افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانے صوبہ سرحد کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے ہیں (۲۲)

اس دور کے افسانہ نگاروں میں حسینہ گل نے بھرپور طریقے سے پشتو افسانے میں تانیثیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پشتون معاشرے میں عورت کا کردار اور نفسیات پر خوب توجہ دی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانہ کے فنی تکنیک اور موضوعاتی تنوع پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ جدید پشتو افسانہ نے تمام نئی جہت اور رجحانات کو اپنے اندر سمویا ہے یہاں تک کہ آج جدید ترین دور کے سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ نئے مسائل و موضوعات بھی پشتو افسانہ میں سموئے ہوئے ہیں۔ پروفیسر اسیر منگل نے چند جدید ترین افسانوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"جدید دور کے یہ جدید ایسے حساس پختون افسانہ نگاروں کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ جدید پشتو افسانہ ایسے ہی نئے موضوعات سے بھرا پڑا ہے۔ سردار علی کا "ختم راتہ" اور "آگ"، اسماعیل گوہر کا "بو یشتــه شـدی اور گورو گهـتال" "علی کمیل قزلباش کا "نمکوے مدار" اور خلیل باور کا "خالی فریم" ایسی کہانیاں ہیں جن میں آج کے مسائل پر سائنٹیفک طریقے سے بحث کی گئی ہے، جو پشتو افسانے کے لئے ایک حوصلہ افزا رجحان ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر رشید احمد کا انقلابی مزشوا، اکرم ذکی کا "گوگو" ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ کا "دریم دوث" "شیرین زادہ خدو خیل کا "خالی لاسونہ" تاج الدین تاجور کا "کروچ" "عصمت بی بی کا "رانگ نمبر" صفیہ حلیم کا "نمکوے اتزعد" سید وحید گل کا "ماتے دیا" اور خورشید اقبال خٹک کا "مشینی انسان" وہ سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور رومانوی کہانیاں ہیں جن میں نئے رجحانات کو فروغ دے کر جدید پشتو افسانے کا قد کاٹھ بڑھایا گیا ہے۔ در حقیقت یہ اس قسم کے افسانے ہیں جو آج کے حالات کے تقاضوں کو فنی انداز میں پیش کرتے ہیں اور ان المیوں کو اجاگر کرتے ہیں جن کا سامنا عالمی سطح پر آج انسان کر رہے ہیں۔ (۳۳)

پشتو کے جدید افسانہ کے بارے میں خصوصی طور پر اور قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانے کے بارے میں عمومی طور پر یہی تاثر ملتا ہے کہ پشتو افسانہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر سفر کرتا رہا اور تمام تر جدید رجحانات، میلانات اور تحاریک کا احاطہ کرتا ہے۔ اسیر منگل کو پشتو کے جدید افسانہ کے بارے میں مجموعی تاثر یہی رہا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

پشتو افسانے کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کا دامن جدید رجحانات سے آراستہ و پیراستہ ہے، جو نہ صرف موضوعاتی لحاظ سے توانا ہے بلکہ فنی اعتبار سے بھی اعلیٰ معیار کا ہے۔ اس میں ایک نئے انداز سے پختونوں کے مسائل پر کھل کر بات ہوئی اور جدید اسلوب پر نئی سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور جنسی کہانیوں نے اس کے دامن کو وسعت بخشی ہے۔ مردوں کے شانہ بشانہ اس صف میں تعلیم یافتہ خواتین افسانہ نگار بھی شامل ہیں جن کی بدولت عصری ضرورتوں کے مطابق ذات کے ان

گنت مسائل پر بحث ہوئی ہے اور ان المیوں کو اجاگر کیا گیا ہے جہاں مرد افسانہ نگاروں کی رسائی ممکن نہ تھی۔

پشتو کے ابتدائی افسانے اور آج کے افسانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہر افسانہ دوسرے افسانے سے تکنیکی اور موضوعاتی لحاظ سے مختلف ہے، جس سے پشتو افسانے کی ارتقائی منازل کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن جس طرح اردو افسانہ بامِ عروج پر کھڑا نظر آتا ہے، پشتو افسانہ ابھی اس مقام پر فائز نہیں ہوا۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں لیکن اس کے باوجود پشتو افسانہ جدید عصری ضرورتوں کے مطابق مختلف النوع مضامین، رجحانات اور میلانات سے مالا مال ہے۔(۴۳)

خلاصے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پشتو افسانہ نے 1971ء سے جو سفر شروع کیا تھا وہ قیام پاکستان تک سست روی کا شکار رہا۔ مگر قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانے نے وہ ترقی کی جس کی مثال فن اور فکر دونوں حوالوں سے دی جا سکتی ہے اور پشتو میں افسانے کا یہ فنی و فکری ارتقائی سفر ابھی تک جاری و ساری ہے۔

☆☆☆

ڈراما

پشتو میں ڈرامے کا آغاز ۱۹۲۷ء میں عبدالاکبر خان اکبر کے ڈرامے یتیمان (تین یتیم) سے ہو چکا تھا۔ اگرچہ ترجمہ شدہ ڈراموں کا وجود اس سے بھی پہلے کے دور میں ملتا ہے مگر باقاعدہ طور پر ۱۹۲۷ء کے بعد پشتو میں ڈرامے لکھے اور سٹیج کیے جاتے تھے جن میں چند مطبوعہ صورت میں بھی دستیاب ہیں۔ سٹیج ڈرامے کا یہ سفر جاری و ساری تھا کہ ۱۹۳۵ء میں پشاور میں ریڈیو اسٹیشن کے قیام سے پشتو میں ریڈیائی ڈرامے کا آغاز بھی ہو گیا۔ ریڈیو کیلئے اسلم خٹک کے پہلے ڈرامے د وینو جام (خون بھرا جام) کے بعد سمندر خان سمندر اور امیر حمزہ شنواری نے لاتعداد ڈرامے لکھے۔ ان کے علاوہ ایس اے رحمن کاکا خیل، رشید علی دہقان، سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل اور چند دیگر بہترین ڈرامہ نگاروں نے ریڈیو کے لئے یادگار ڈرامے لکھے۔ یوں ریڈیائی ڈرامے کا سفر جاری و ساری رہا جو قیام پاکستان کے بعد ابھی جاری ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پشتو ڈرامہ

قیام پاکستان کے بعد پشتو میں سٹیج ڈرامے کا سفر انتہائی سست روی کا شکار رہا۔ البتہ قیام پاکستان کے بعد پشتو میں ریڈیو کے لئے تسلسل سے ڈرامے لکھے جا رہے تھے۔ جب ۱۹۷۴ء میں پشاور میں ٹی وی اسٹیشن کا قیام عمل میں لایا گیا تو ریڈیائی ڈرامے کا یہ سفر ٹی وی ڈرامے تک بھی آ پہنچا۔ ان ڈراموں میں کئی کتابی صورت میں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان کیلئے جن ڈرامہ نگاروں نے کام کیا ان میں چند ایسے بھی تھے جنہوں نے قیام پاکستان سے پہلے بھی ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے تھے۔ نامور ادیب و محقق ایوب صابر نے اپنی کتاب جدید پشتو ادب میں چند متفرق ڈراموں اور ڈرامہ نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

محمد اشرف مفتون اور سید رسول رسا کا شمار بھی ریڈیو کے بہترین ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ محمد اشرف مفتون کے ریڈیائی ڈراموں کا ایک مجموعہ "حیدر" کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ اسی طرح سید رسول رسا کی ایک کتاب "رنګا رنګ ګلونه" "رنگ رنگ کے پھول" میں جہاں افسانے

اور مضامین ہیں وہاں ڈرامے بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے حال ہی میں چار ایکٹوں پر مشتمل ایک طربیہ ڈرامہ "ژوند دورنج" (زندگی کا دورنج) بھی مکمل کیا ہے جو زیر طباعت ہے۔ اس ڈرامے میں انہوں نے نہایت فلسفیانہ اور عالمانہ انداز میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عشق کا آغاز دراصل زندگی کا آغاز اور عشق کی موت زندگی کی موت ہے۔

ایس اے رحمٰن، رضا ہمدانی اور شوکت اللہ اکبر نے بھی ریڈیو کے لئے لاتعداد ڈرامے لکھے ہیں۔ ایس اے رحمٰن کے ڈراموں کے دو مجموعے "تربور" اور "نیمگڑے خوب" (ادھورا خواب) کتابی صورت میں بھی چھپ چکے ہیں۔

رشید علی دہقان نے بھی اس میدان میں رنگارنگ نقوش چھوڑے ہیں بلکہ وہ تو اس زمانے سے ڈرامے لکھ رہے ہیں جب وہ سید رشید تھے اور کالج کے طالب علم تھے۔ بعد میں جب انہوں نے دہقان "بن کر" "د سرو تعویذ" "سونے کا تعویذ" لکھا تو ان کا شمار پشتو کے اونچے ڈرامہ نگاروں میں ہونے لگا۔ پچھلے دنوں ان کا ایک ڈرامہ "ڈرامہ وبورے" ٹی وی پر پیش کیا گیا تھا جو اب تک ٹی وی پر پیش کیے جانے والے پشتو کے تمام ڈراموں سے بہتر تھا۔ رشید علی دہقان فنی پختگی کے کئی مراحل طے کر چکے تھے۔ وہ پشتو ادب میں کئی اچھے ڈراموں کا اضافہ کرنے کے بعد اب اس موڑ پر آگئے تھے جہاں سے پشتو کے جدید ڈرامے کا ارتقائی سفر شروع ہوتا ہے مگر چند ماہ قبل اچانک ان کی حرکت قلب بند ہو گئی اور پشتو ادب ایک ایسے ڈرامہ نگار سے محروم ہو گیا جس کی گرفت فن پر بہت مضبوط تھی۔

محمد افضل رضا اور عمر ناصر جدید دور کے دو اچھے ڈرامہ نگار ہیں اور اب تک ان دونوں کے بیسوں ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ محمد افضل رضا نے اپنی کتاب "ڈرامہ" میں جہاں ڈرامے کی فنی حیثیت سے متعلق بحث کی ہے وہاں اپنے دو ڈراموں "تورہ چہ تیزیژی" (تلوار جو تیز ہوتی ہے) اور "بے غرضہ کچکول" (بے غرضی کا کشکول) کتابی شکل میں بھی چھپائے ہیں۔ اسی طرح پریشان خٹک تحقیق کے علاوہ تخلیق کی طرف بھی متوجہ ہیں اور اب تک ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے کئی ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ راقم الحروف کا ڈرامہ "ژغوندے" نہ صرف ریڈیو سے نشر ہوا بلکہ وہ ماہنامہ میں چھپ کر جدید ڈرامے کے قارئین سے خراج تحسین بھی وصول کر چکا ہے اس کے علاوہ راقم الحروف کے کئی دیگر ڈرامے بھی ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔

مراد شنواری کا شمار بھی جدید دور کے اچھے ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ رشید علی دہقان کی

طرح فن پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہے۔ قلندر مومند نے بھی ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھنے کی ابتداء کر دی ہے اور مراد شنواری کے علاوہ ان سے بھی بہتر ڈرامائی تخلیقات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

گل افضل خان کا رشتہ بھی ریڈیو اور سٹیج ڈراموں سے بہت پرانا ہے اور وہ جب بھی لکھتے ہیں تو اس کے کرداروں میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔

سعد اللہ جان برق نے بھی پشتو ادب میں متعدد اچھے ڈراموں کا اضافہ کیا ہے ان کے کوئی ڈرامے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپ چکے ہیں اور ریڈیو پشاور سے نشر بھی ہوتے رہے ہیں ان کا انداز تحریر جدید ڈرامہ نگاری کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔(۲۵)

قیام پاکستان کے بعد ریڈیو کے لئے جن لکھاریوں نے زیادہ ڈرامے لکھے ان میں نمایاں ڈرامہ نگاروں کے نام درج ذیل ہیں۔

"سید رسول رسا، مبارک سلطانہ شمیم، اکرم فاروق شنواری، اکرم مشہود، ناظر شنواری، مراد شنواری، مظہر شاہ کاکا خیل، نثار مظلوم، عبدالودود، عبداللہ جان اسیر، اشرف مفتون، اشرف درانی، عبداللہ جان مغموم، شوکت اللہ اکبر اور عبدالخالق خلیق کے نام ابتدائی دور میں زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے بعد ایوب صابر، قلندر مومند، حافظ ادریس، ذکیہ حلیم، زاہدہ حلیم قریشی، مرزا خان، ثنا بیگم، اے داؤد، جان محمد زلے، ایاز داؤد زے، خالق داد امیر، رضا عبدی، ساحر آفریدی، سعداللہ جان برق، سیف الرحمٰن سید، شاہ افضل خان، گل افضل خان، عمر ناصر، نثار محمد خان، محمد افضل رضا، محمد اعظم، ترجمان بانو، ہمایوں ہما، مختیار احمد زاہد، سید ممتاز علی شاہ، ولی محمد طیل، یونس قیاسی اور ارباب عبدالوکیل کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

نئی پود کے ڈرامہ نگاروں میں سید وحید، گل محمد بیتاب، حیران محمد زئی، فرید اللہ شاہ حساس اور چند دیگر ڈرامے لکھ رہے ہیں۔(۲۶)

ان ریڈیائی ڈراموں میں سے کچھ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں اور چند ایسے ڈرامے بھی تھے جو صرف اشاعت کیلئے لکھے گئے اور کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ان مطبوعہ ڈراموں میں ایسے بھی تھے جو مکمل ڈرامہ الگ کتاب کی صورت میں چھپا اور کئی کتابیں مختصر ڈراموں کے مجموعوں کی صورت میں بھی اشاعت پذیر ہوئیں۔ الگ کتابوں کے علاوہ کچھ ڈرامے مختلف رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوئے۔ پرنٹ میڈیا کے یہ تمام ڈرامے اب مطبوعہ صورت میں محفوظ ہیں جن کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب مختصر تاریخ زبان و ادب پشتو میں یوں کیا تھا۔

مبارک سلطانہ شمیم نے اپنی کتاب "نوے سحر" (نئی صبح) 1958ء میں شائع کی۔ ایس اے رحمٰن کا کاٹیل کے تین ڈراموں پر مشتمل مجموعہ "نیمگڑے خوب" (ادھورا خواب) 1962ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ان کے دو اور ڈرامے "اور او اوبہ" (آگ اور پانی) اور "ترہور" چچازاد بھی شائع ہوئے۔ ڈاکٹر محمد اعظم کے اشاعتیوں میں مختصر ڈراموں کا مجموعہ "شے" 1971ء میں شائع ہوا۔ اس دوران سید رسول رسا کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ "رنگا رنگ گلونہ" (رنگ برنگے پھول) اشرف مفتون کے ڈراموں کا مجموعہ "حیدر" افضل رضا کے دو ڈرامے "تورہ چی تیرہ ٹری" (تلوار جو تیز ہوتی ہے) اور "رستم و سہراب" (ترجمہ) زیتون بانو "ہندارہ" (آئینہ) کا کچھ حصہ ڈاکٹر بخت روان کا "اصحاب کہف" (ترجمہ) ملک ناز تیاز کا "فرید خان" اور ڈاکٹر بہاء الدین مجروح کا "دخان خانی خمار" (تنہائی کا اژدھا) بھی شامل ہوئے۔

اسی طرح کچھ پشتو ڈرامے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے جیسے امیر حمزہ شنواری کا "ژرندہ گرځی" (پن چکی چلانے والا) عبدالاکبر خان اکبر کا "کاروان رحمان رحمان دے" 31 مئی 1952ء کے ہفت روزہ "رہبر" میں شائع ہوا ہے۔ رہبر میں صرف "کاروان" لکھا ہے جو غلط ہے۔ گل قلندر مومند کا ترجمہ ڈرامہ میکبتھ اور دیگر ڈرامہ نگاروں کے طبع زاد اور ترجمہ ڈرامے مختلف رسائل و جرائد میں چھپے۔ چند ڈراموں کا ذکر محمد افضل رضا نے کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

پېښتنه	محمد اقبال اقبال
ترېور، په سفر کښې	رضا مهمندی
خېبره	خالقداد اُمید
پښېمانه	عبد الله جان مغموم
غوټئی	فضل احمد غازی
په سپوږمئی کښې	همایون هما
زخمونه	ایوب صابر
سپېنې سپېنې	سحر یو سفزی(۲۸)

قیامِ پاکستان کے بعد پشتو ڈرامے کے ارتقائی سفر میں ٹی وی کا کردار بہت اہم رہا ہے جس کا مختصر تذکرہ پہلے مباحث میں ہو چکا ہے۔ یہاں ٹی وی ڈرامے کے بارے میں اجمالی اظہار خیال چند

ڈراموں کی مثالوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں پہلا ٹی وی سٹیشن 1965ء میں لاہور میں قائم ہوا۔ 1969ء میں جب راولپنڈی میں سٹیشن قائم ہوا تو آغوش کوہستان کے نام سے نشر ہونے والے پروگرام میں پشتو کا حصہ بھی تھا۔ اس پروگرام کے زیر سایہ پشتو کا پہلا ٹی وی ڈرامہ "خپل پردی" (اپنے پرائے) نشر ہوا جو اردو ڈرامے "کانچ کا گھر" کا ترجمہ تھا۔ یہ ترجمہ ہدایت اللہ خان ایڈوکیٹ نے کیا تھا۔

راولپنڈی اسلام آباد سے 1974ء تک پشتو کے ڈرامے نشر ہوتے رہے ہیں۔ 1974ء میں پشاور میں ٹی وی سٹیشن کھلنے کے ساتھ پشتو ٹی وی ڈرامے نے بہت ترقی کی۔ ٹی وی کے لئے ابتدائی دور کے ڈرامہ لکھنے والوں میں رشید علی دہقان، امیر حمزہ شنواری، خیال بخاری، سردار خان فنا، عبداللہ جان اسیر، گل افضل خان اور ہدایت اللہ خان نے ڈرامے لکھے۔ دوسرے دور میں جو آج تک جاری ہے خالقداد امید، عبداللہ جان مغموم، ساحر آفریدی، ادب اب عبدالوکیل، محمد اعظم اعظم، افضل رضا، محمد اقبال اقبال، ولی محمد طوفان، ہمایوں ہما، سعد اللہ جان برق، نور البشر نوید، عمر ناصر، شیر زمان طوفان، زیتون بانو، فرید اللہ شاہ حساس، ہمایوں ہما، امیر سردار بادشاہ اور محب اللہ شوق نے کئی ڈرامے لکھے ہیں۔

ٹی وی میں زیادہ مقبولیت ان ڈراموں کو ملی جو کئی اقساط پر مشتمل سلسلے وار پیش ہوتے رہے۔ اس قسم کے ڈراموں کی تفصیل افضل رضا صاحب نے یوں بتائی ہے:

محمد اعظم اعظم

ورکے لارے	دس اقساط	1975ء
روخانہ تیرے	سولہ اقساط	1977ء
سوری او ستوری	اٹھارہ اقساط	1979ء
ناسور	بیس اقساط	1980ء
زولنے	پچیس	1982/83ء

گل افضل خان

لارے لاروے	بارہ اقساط	1978ء
فقیر شہزادہ	نو اقساط	1987ء

سعد اللہ جان برق

وگے	تیرہ اقساط	1977ء
بادر	تیرہ اقساط	1978ء
خالق داد امید		
بندوبند	بارہ اقساط	1984ء
نثار محمد خان		
زول او ژوبہ	تیرہ اقساط	1980ء
نورالبشر نوید		
پرخشا	چودہ اقساط	1985ء
افضل رضا		
نوے منزل	بارہ اقساط	1978ء
احساس	تیرہ اقساط	1879ء (۲۸)

افغانستان کے محقق محمد داود وفا نے اپنی کتاب "د پشتو معاصر ادب تاریخ" پشتو کے معاصر ادب کی تاریخ میں مختلف ادوار پر بات کی ہے۔ انہوں نے پاکستان کے صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) میں لکھے گئے ڈرامے کا قیام پاکستان سے 1991ء تک کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے چند بڑے اور نمایاں ڈرامہ نگاروں کی تفصیل یوں پیش کی ہے۔

خیال بخاری، عمر ناصر، زیتون بانو، نثار محمد خان، ارباب عبدالودود، نثار مظلوم، ذکیہ حلیم، ولی محمد خلیل، محمد افضل رضا، مشتاق، سعد اللہ جان برق، محمد ہمایوں ہما، محمد اشرف مفتون، ایوب صابر، اشرف درانی، مس زاہدہ، حلیم قریشی، عطا محمد خان خلیل، یونس قیاسی، محب اللہ شوق، عبداللہ جان مغموم، افتخار احمد زاہد، لطیف وہمی، خالق داد امید، سید سردار باچا، سیف الرحمان سید، رشیدہ بٹ، درخواز نواز، ایس ایم رشید علی، ایچ ایم ادریس، جمیل بخش شاہ، افضل، جان محمد زئی، سردار خان فنا، عرفان اللہ عرفان، احسان دانش، افضل باقی، افتخار الدین، ارباب عبدالوکیل، امین اللہ امین، گل افضل خان، حافظ محمد ادریس، سیدہ ناز جاوید، سید تقویم الحق کاکاخیل، ساحر آفریدی، قلندر مومند، محمد اعظم اعظم، شیر محمد کامران، محمد اکبر اکبر، شرف الدین مخلص، عبدالرسول امین، بہار الدین بیگم، ایاز داود، سید مظہر شاہ کاکاخیل، ایس اے رحمان، ادیب سرحدی، ولی اللہ ذوبجارہ، سراج محمد خٹک، عبداللہ جان اسیر، ایاز داودزی، نورالبشر نوید، احمد امین

امین، رحمت شاہ سائل، عشق حسین اکبر پوری، سید شہزاد، بابا انور (۴۹)۔

1991ء کے بعد جدید دور کے ڈرامہ نگاروں کی فہرست محمد داؤد وفا یوں پیش کرتے ہیں۔

مجید اللہ خلیل، نور البشر نوید، گل محمد بیتاب، محمد اقبال حیران، فرید اللہ شاہ حساس، محمد امین امین، ساحر آفریدی، یونس قیاسی، رحمت شاہ سائل، محمد ہمایوں ہما، محمد اعظم اعظم، سید حید گل، سعد اللہ جان برق، صاحب شاہ صابر، طاہر بخاری، زوبیر حسرت، لائق زادہ لائق، خالقداد امید، زاہدہ کھا، حیف الرحمان سید، سید ممتاز علی شاہ، اشفاق خلیل، امیر منگل، سید عطیہ پروین، ہمایوں ہمدرد، مشتاق شباب، عارف شفیع، عتیق اللہ شیخ، عظمت ہما، عجاز کوثر نگار، خالد کبل ملک، نذر محمد (۵۰)۔

قیام پاکستان کے بعد پشتو ڈرامے نے سٹیج، ریڈیو اور ٹی وی تینوں شعبوں میں تسلسل سے سفر جاری رکھا۔ البتہ سٹیج ڈرامے پر وقت کے ساتھ ساتھ توجہ کم ہوتی گئی اور ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے کا سفر شدت کے ساتھ جاری رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ پشتو ڈرامے مطبوعہ صورت میں بھی سامنے آتے گئے۔ محمد داؤد وفا نے اپنی کتاب پشتو معاصر ادب کی تاریخ کے لئے مطبوعہ ڈراموں کی ایک فہرست بڑی محنت سے تیار کی ہے جس میں کچھ کے چند ڈرامے افغانستان سے پشتون ڈرامہ نگاروں نے لکھے ہیں اور باقی تمام ڈرامے پاکستان کے پشتون ادیبوں کے تحریر کردہ ہیں۔

اس فہرست میں قیام پاکستان کے بعد جو ڈرامے منظر شہود پر آئے اُن کی فہرست پیش نظر ہے۔

دمزدور دونیا: سعادت خان، جلبل، پیښور

دوه بنی: نصر الله خان نصر، ۱۹۵۱م، پیښور

دمینی شیبدان: میرا جان سیال ۱۹۵۳ م پیښور

درس عبرت: امیر نواز جلیا، ۱۹۵۴، م، پیښور

دیمگری خوب: ایس اے رحمان، ۱۹۵۵م، پیښور

حیدر: اشرف مفتون، ۱۹۵۸م، پیښور

میئداه (حصه برخه): زیتون بانو، ۱۹۵۸م، پیښور

تغمی: محمد ابراهیم شبنم، ۱۹۵۸، م، پیښور

کلیمه اداره رویی: عبد الرحمان پژواک، ۱۹۵۸م، کابل

نوی سحر : مبارک سلطانه شمیم ، ۱۹۵۸ء م پیښور

دژوند ملګری: احمد ګل ، ۱۹۵۸ م ، پیښور

نوی روښنی : قاضی رحیم الله ،۱۹۵۸ م،پیښور

اوراوبه: ایس اے رحمان ،۱۹۲۰ م ، پیښور

توره چی تیریږی: محمد افضل رضا، ۱۹۶۲ م،پیښور

خورژوند : عبد الخالق خلیق، ۱۹۶۳ ،پیښور

لښی: محمد اعظم اعظم، ۱۹۶۳ م،پیښور

چهری(خیری) : عبد الکریم مظلوم، ۱۹۶۵ م،پیښور

ګناه د چاده : افضل رضا، ۱۹۶۶ ،پیښور

تربور: رحیم شاه نسیم ،۱۹۸۱ م ،پیښور

تربور عرف دونیا: ایس ای رحمان ، ۱۹۸۱ م،پیښور

دبی ارزی کچکول: افضل رضا، ۱۹۸۱ م،پیښور

دژوند دوزخ: میاں سید رسول رسا ،۱۹۸۳ م،پیښور

پرونی : محمد اقبال حیران، ۱۹۸۳ م،پیښور

سری لمبی : سید رسول رسا ، ۱۹۸۴ م،پیښور

رنګا رنګ ګلونه: میا سید رسول رسا ۱۹۸۵ م،پیښور

رواج: افضل رضا، ۱۹۸۶ م،پیښور

کلی ګلونه : منظر فریادی ، ۱۹۸۹ م،پیښور

درامه ګی : ګل افضل خان،۱۹۸۰ م،پیښور

شلغاتی : پیر ګوهر،۱۹۸۰ م،پیښور

درشهوار : عبد الروف نوشهروی/ محمد یوسف کا کا خیل ۱۹۸۰، پیښور

کاینات: سیف الرحمان سید ، ۱۹۸۱ م،پیښور

تناژغه: عبد الحنان شوق ، ۱۹۸۴ م،پیښور

کوبیدن:اسیر منگل ،۱۹۸۲م، پیښور

کدیه په سر: خالقداد، امید ، ۱۹۸۵م، پیښور

زما ارمان: ای زید جسیم ،۱۹۸۷م،پیښور

زور گنهگار: عبدالرووف بینوا،۱۹۸۸م، کابل

گل تسا: میاں عبد الرازق،۱۹۸۹م،پیښور

دمجاهد عسکرمینه: بادام ظریفي،۱۹۹۰،پیښور

ضدیان: نثار مظلوم،۹پیښور

فرید خان: فلک نیاز نیاز، ۹پیښور

تر ۱۹۹۱م کال وروسته بیا دا مجموعي چاپ دی

کچکول: زیتون بانو ،۱۹۹۱،پیښور

راجکماري: ماعبد الرازق،۱۹۹۲م،پیښور

حاجي میرویس خان: بلا بري،۲۰۰۱ز،پیښور

پروني: محمد اقبال حیران،۲۰۰۲،پیښور

بتینه: محمد اقبال حیران،۲۰۰۲،پیښور

دالري معاش: ایمل پسرلی،۲۰۰۲م،پیښور

پرېوتي خبري: حفیظ الله تراب، ۲۰۰۵م،پیښور

بنګلا: ایاز داودزی،۲۰۰۸م،پیښور

کربني (شپږدرامې): ارباب عبد الوکیل،۲۰۰۸م،پیښور

زړونه پوښول: محمد اقبال حیران ، ۲۰۱۰م،پیښور

دري قیصې (دوه درامې): فضل رحیم ساقي ،۲۰۱۳م،پیښور

تماشې: داکتیر محمد زوبیر حسرت ،۲۰۱۴م،پیښور

ان تمام سٹیج، ریڈیو، ٹی وی اور مطبوعہ ڈراموں کے موضوعات پر اگر تبصرہ کریں گے تو واضح طور پر پشتونوں کی دیہاتی معاشرت خواتین کے مسائل مختلف رشتوں کی پاسداری تعلیم کی طرف رغبت کا درس دینا، سماجی ناہمواری دور کرنا، آپس کی لڑائی، دشمنی اور جہالت کا انجام اور چند دیگر حقوق

موضوعات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ موضوعات کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی ان تمام مطبوعہ، سٹیج، ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں میں بنیادی عناصر کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

پرنٹ میڈیا کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا کے لئے بھی ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے کے الگ الگ تکنیکی تقاضوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ غرض قیام پاکستان کے بعد پشتو ڈرامے نے ترقی کی وہ منازل طے کی ہیں کہ کئی ڈرامے پشتو سے اردو میں بھی ترجمہ ہوئے ہیں اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پورے ملک اور ملک سے باہر بھی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

☆☆☆

سفرنامہ

سفرنامہ کی روایت نہ صرف عالمی ادب میں بہت قدیم ہے بلکہ پشتو ادب میں بھی سینکڑوں برس قبل اس صنف کا سراغ ملتا ہے۔ پشتو کے کلاسیکی شاعر خوشحال خان خٹک نے پشتو ادب میں سفرنامہ لکھنے کی ابتدا کی۔ انہوں نے دو سفرنامے لکھ کر سوات نامہ (منظوم) اور ہندوکو نامہ (منثور) کے ذریعے سے پشتو ادب میں سفرنامہ کی روایت کی بنیاد ڈالی۔ خوشحال خان خٹک کے بعد بیسویں صدی کے آغاز تک پشتو میں سفرنامہ نگاری کا سفر تعطل کا شکار رہا اور پھر ۱۹۰۵ء میں میاں نعمان الدین کے ترجمہ شدہ سفرنامہ ابن بطوطہ کا تذکرہ ملتا ہے جس کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کوئی نمونہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ دستیاب سفرناموں میں مرزا دوست محمد قندہاری کا سفرنامہ حج ۱۹۱۱ء میں شائع شدہ دستیاب ہے۔ اس کے بعد قیام پاکستان ۱۹۴۷ء تک گنتی کے چند سفرنامے منصہ شہود پر آئے جن میں نصر اللہ خان نصر کا "د امب سفر" (ریاست امب کا سفر) ۱۹۳۶ء میں لکھا ہوا سفرنامہ بہت بعد میں ۱۹۷۶ء میں مطبوعہ صورت میں سامنے آیا۔

سفرنامہ قیام پاکستان کے بعد

پشتو میں سفرنامے کا باقاعدہ سفر قیام پاکستان کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ امیر حمزہ شنواری کا ۱۹۴۸ء میں لکھا ہوا منظوم سفرنامہ کابل ۱۹۴۹ء میں مطبوعہ صورت میں سامنے آتا ہے اور پھر اُن کے دیگر سفرنامے نئے پشتون (نیا پشتون) ۱۹۵۸ء میں اور چوڑ سفر (چوڑ کا سفر) ۱۹۶۰ء میں شائع ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں کاکاجی صنوبر حسین نے ابن بطوطہ کا شہرہ آفاق سفرنامہ پشتو میں ترجمہ کر کے پشتو سفرنامہ نگاری کے سفر میں ایک اور گراں قدر اضافہ کیا۔ اس سے پہلے کاکاجی صنوبر حسین نے ایک اور مختصر سفرنامہ "لہ چکدرے نہ تر دیرے" (چکدرہ سے دیر تک) ۱۹۳۹ء میں لکھا تھا جو ماہنامہ اسلم میں قسط وار شائع ہوا تھا مگر اُن کا اصل کارنامہ سفرنامہ ابن بطوطہ کا ترجمہ ہے جس کے بارے میں میں نے اپنی کتاب کاکاجی صنوبر شخصیت اور فن میں لکھا تھا:

یہ ترجمہ کاکاجی صنوبر نے 1952ء میں گرفتاری کے بعد ڈیرہ اسمٰعیل خان کی جیل میں کیا تھا۔ جس کا پیش لفظ فارغ بخاری صاحب نے 16 نومبر 1954ء کو پشاور جیل میں لکھا تھا۔ جیسا کہ فارغ بخاری نے اپنی تحریر میں اشارہ کیا کہ یہ ترجمہ بہت رواں اور سلیس پشتو میں ہے۔ میرے خیال میں بھی خوبی ترجمہ میں ہونا ضروری ہے۔ سفرنامہ کی صنف میں مصنف کا اپنا منفرد اسلوب ہوتا ہے۔ مصنف کا اصل مقصد کسی ملک کے جغرافیہ، ثقافت، اقدار اور دیگر ضروری معلومات کو پیش کرنا ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ ایک دلکش اسلوب اور خوبصورت زبان میں ہونا چاہیے۔ ابن بطوطہ نے چونکہ یہ سفرنامہ عربی زبان میں لکھا ہے اور دنیا کی دیگر بڑی زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہوئے ہیں۔ لہذا تمام مترجمین کو اپنی زبان کی لسانی ساخت، روزمرہ اور محاورہ کو مدنظر رکھ کر ترجمہ میں بھی ایک منفرد اور دلکش اسلوب کو اپنانا پڑتا ہے۔ کاکاجی صنوبر نے اگرچہ اس سفرنامہ کو عربی سے براہ راست ترجمہ نہیں کیا لیکن پھر بھی مصنف کی تحریر کی اصل روح اس میں جھلکتی ہے۔ یہی اس ترجمے کی خوبی اور مترجم کے قلم کا کمال ہے۔

کاکاجی صنوبر کے اس ترجمے کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ آپ نے براہ راست ابن بطوطہ کی تحریر کو اردو سے لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا بلکہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اپنا تبصرہ بھی کیا ہے۔ یوں اس ترجمے کا انداز بیانیہ ہو گیا ہے۔ اصل روح ابن بطوطہ کی تحریر کی ہے اور ساتھ کاکاجی صنوبر کی پشتو تحریر کا ایک منفرد اسلوب بھی سامنے آتا ہے(۵۲)

اپنی دوسری کتاب بابائے غزل میں، میں نے امیر حمزہ شنواری کے سفرنامہ کابل پر بھی تبصرہ کیا تھا۔ اس تبصرہ کا کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''افغانستان میں جشن " جلـوا کـی " آزادی کے موقع پر افغانستان کی حکومت نے پشاور کے شعراء و ادباء کو بھی جشن میں شرکت کی دعوت دی تھی تا کہ پشتو کے رسم الخط پر بھی مشترکہ بحث و مباحثہ ہو جائے۔ حمزہ بابا نے اس سفر کا حال منظوم سفرنامے کی شکل میں قلم بند کیا ہے۔ اس منظوم سفرنامے پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس سفر اور افغانستان کی حکومت کی جانب سے دعوت کا منظر ہم مرحوم قیام الدین خادم کے قلم سے واضح کرتے ہیں:

مرحوم سپہ سالار شاہ محمود خان کی صدارت کے دوران پشتو ادب میں پشاور میوزیم کے مدیر عبد الشکور کی دعوت پر پشاور میں ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے گئے۔

پشاور کے بہت سے علما فضلا ان اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے۔ پشاور میں ہمیں بہت سی

حکومتی اور رسمی دعوتیں دی گئیں۔ ان مراسم کے ختم ہونے کے بعد ہم نے پشاور کے دس پندرہ ادباء کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ یہ تجویز ہم نے غازی شاہ محمود خان کے دستخط سے پہنچائی تھی۔ اس کے نتیجے میں مدعو شدہ ادباء پشتو ٹولنہ کی دعوت پر کابل آئے۔ جن میں مولانا عبدالقادر، خانمیر ہلالی، محمد نواز خٹک، سید رسول رسا، ملک سیدا خان شنواری، عبدالخالق خلیق، سید انوار الحق اور ہمارے شاعر حمزہ صاحب بھی شامل تھے۔ یہ اگست 1948ء کی 22ویں تاریخ تھی جس کا ذکر حمزہ بابا نے اپنے منظوم سفر نامے میں کیا ہے۔

"یہ سفرنامہ نو سو 900 ابیات پر مشتمل ہے۔ ترکیب بند شکل میں ہے۔ چھیانوے صفحات پر مشتمل کتابی صورت میں 1949ء میں پشاور میں شائع ہوئی لیکن حکومت کی طرف سے اس پر پابندی لگا دی گئی اور صرف چند کاپیاں لوگوں کے ہاتھ آ گئیں۔

بعد میں یہ سفرنامہ مردان سے شائع ہونے والے پشتو رسالے "رہبر" میں قسطوں میں شائع ہونا شروع ہوا لیکن پھر بھی مکمل شائع نہ ہو سکا اور چند اقساط شائع ہونے کے بعد باقی رہ گیا۔ رہبر کے اداریے میں پہلی قسط کے ساتھ نوٹ میں لکھا:

"یہ منظوم سفرنامہ امیر حمزہ شنواری نے 1948ء میں لکھا تھا جب وہ ہمارے دیگر ادباء کے ساتھ افغانستان کے جشن میں مدعو ہوئے تھے۔ اس طویل منظوم سفرنامے میں اگر ایک طرف حمزہ شنواری نے تمام روداد سفر بیان کیا ہے تو دوسری طرف نظم میں بھی آپ نے تغزل کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ قاری جب ایک بند پڑھتا ہے تو ایک طرف آپ کی شاعرانہ چاشنی قاری کو نہیں چھوڑتی اور دوسری طرف آخری مصرعے کے ختم ہوتے ہی دوسرے بند کا پہلا مصرعہ قاری کو اس خوبی سے اپنی طرف کھینچتا ہے کہ وہ بغیر سوچ کے دوسرا بند پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ ہم امیر حمزہ خان شنواری کا بہت شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے رہبر کے قارئین کو اتنی بڑی بخشش دی۔

"رہبر" میں اس سفرنامے کی نو سے زیادہ اقساط شائع ہوئی ہیں لیکن مجھے محترم ہمیش خلیل کی لائبریری سے صرف پہلی، دوسری، پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں قسط ملی ہے اور میں دستیاب مواد کی موجودگی میں اس سفرنامے پر تبصرہ کرتا ہوں۔ سفرنامے پر تبصرہ شروع کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اس سفرنامے کو "سفرنامہ کابل" کا نام اس لیے دیا کہ حمزہ بابا نے خود اس کا یہ نام رکھا تھا جو محمد نواز خٹک کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے:

"1948ء میں پشتو ٹولنہ کابل کی دعوت پر حمزہ صاحب، خلیق صاحب، رسا صاحب، ڈاکٹر انوار الحق صاحب، مولانا عبد القادر مرحوم، سید جان شنواری مرحوم، بلالی مرحوم اور میں ہمسفر تھے۔ اس سفر کی روداد عظیم حمزہ صاحب نے "سفرنامہ کابل" کے عنوان سے خوبصورت انداز میں منظوم کی ہے جو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے (۵۳)۔

اس دور میں کچھ سفرنامے افغانستان کے پشتون لکھاریوں نے بھی لکھے مگر یہاں ہمارا موضوع پاکستان میں پشتو کا سفرنامہ نگاری ہے اس لئے ہم یہاں قیام پاکستان کے بعد پاکستانی پشتون ادیبوں کے سفرناموں پر بحث کرتے ہیں۔

پشتو سفرنامے کی تاریخ میں طاہر آفریدی کا نام سفرنامہ میں جدت، شوخی تحریر اور بہترین منظر نگاری کے لحاظ سے زیادہ اہم ہے "سفر په خیر" (سفر بخیر) اور "سفر مدام سفر" (سفر مسلسل) آپ کے دو سفرنامے ہیں۔ اول الذکر سفرنامہ سنگاپور کے سفر کا احوال بتاتا ہے جس میں مصنف نے جابجا اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے اور عالمی تناظر میں طبقاتی نظام پر کڑی تنقید کی ہے۔ یہ سفرنامہ 1985ء میں شائع ہوا۔ دوسرا سفرنامہ انگلینڈ اور مصر کے سفری احوال پر مشتمل ہے جس میں مغربی تہذیب و تمدن کے منفی پہلوؤں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ رنگین و حسین مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے اپنی شوخی تحریر کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ طاہر آفریدی کے دونوں سفرنامے قصہ پن، تجسس و تحیر اور زبان کی روانی و شگفتگی کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہیں۔

طاہر آفریدی کے بعد جدت و رنگینی کے حوالے سے افضل شوق کا نام آتا ہے۔ افضل شوق کا پہلا سفرنامہ "اووه ګامه منزل" (سات قدموں کا سفر) اصل میں سات ممالک کا سفر ہے۔ یہ سفرنامہ 1996ء میں شائع ہوا ہے جس میں سری لنکا، سنگاپور، ملائیشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ایران اور ترکی کے سفری حالات بہت دلچسپ انداز سے بیان کیے گئے ہیں۔ افضل شوق کا دوسرا سفرنامہ دو جلدوں میں دو مختلف عنوانات سے "منزل به وا وروو بانندے" (برف پر چلنا) اور "د لمر د ګلی په لور" (سورج کے دیس کی طرف) کے ناموں سے بالترتیب 2004ء اور 2005ء میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ بظاہر تو دو سفرنامے نظر آتے ہیں لیکن دونوں کا سفری تسلسل ایک ہے۔ گویا ایک سفرنامے کے دو حصے ہیں۔ اس سفرنامہ میں افضل شوق نے کئی مغربی ممالک کے مختلف پہلوؤں کا مشاہدہ کر کے پیش کیا ہے جو معلوماتی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

پشتو کے دیگر سفرناموں میں نواز طائر کا "د حاتم طائی سفرنامہ" (سفرنامہ حاتم طائی) مترجم، اور "نالیدے سوات" (ان دیکھا سوات)، امیر منگل کا "د امرتو سفر" (سفر متحدہ عرب امارات) اور "شګو کښې رنګونه" (ریت میں رنگینیاں)، شیرت تخیال کا "د دوزخ د اور په لمبو کښې سوځیدلې جنت" (دوزخ کی آگ میں جلتی ہوئی جنت)، عبدالصمد مجید کا "عری تهي نه ډهر ګو سره ځم" (قریہ قریہ پھرا کرتا ہوں)، محمد عظیم ایڈووکیٹ کا "هم سفیلونه هم ګر ګری" (سفر کا سفر حضر کا مزہ)، محمد ایاز کا "د ېدن شه دی نا خښه راغلو" (دیدار کیلئے ہونے میں دیر ہوئی)، صابر شاہ صابر کا خیالی سفرنامہ "د پښتونخوا سیل او سفر" (پشتونخوا کی سیر اور سفر)، "د نورو نو بناریه کښې" (رنگ ونور کے دیس میں)، ہمرے کا سفر نامہ "چیدوری او" (واحطو دگے تو پاؤ گے) اور محمد سراج کا غیر مطبوعہ سفرنامہ "پیښور نه کلکتې پوری" (پشاور سے کلکتہ تک) اور ڈاکٹر سہیل انشا کا "د بټګرام ادبي سفر" (بٹگرام کا ادبی سفر) وحدت میں قسط وار مطبوعہ سفرنامے شامل ہیں (۵۳)۔

ڈاکٹر شیر زمان طائزی کے چار مختصر سفرناموں پر مشتمل اناسی (79) صفحات کا مجموعہ 2007ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل سفرناموں کے بارے میں سلیم راز نے لکھا ہے:

"اس کتاب میں دو منظوم اور دو منثور تحریریں شامل ہیں۔ منظوم تحریروں میں ایک کابل سے قندھار اور دوسری مزار شریف کی جانب سفر کا احوال ہے۔ منثور تحریروں میں ایک کابل کی سیاحت اور دوسری تحریر فریضہ حج کی ادائیگی کے دوران درپیش واقعات سے متعلق ہے (۵۵)۔

اس مجموعہ "کابل مې بیا ولیدو" (کابل کو ایک دفعہ پھر دیکھ لیا) میں شامل سفر ناموں پر کچھ رپورتاژ کا اثر نمایاں ہے اور کچھ ذاتی روزنامچے کا۔ سلیم راز نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے اور خود مصنف کے مشاہدات بہت دلکش پیرائے میں اس مجموعے میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ کئی سفر ناموں پر مشتمل پشتو میں یہ پہلا مجموعہ ہے جس کا تجربہ ڈاکٹر شیر زمان نے کیا ہے۔

رحیم شاہ رحیم کا سفرنامہ "د نننی دیر" (آج کا دیر)، عبدالصمد درانی کا "کینیډا کښې سلور میاشتې" (کینیڈا میں چار مہینے) اور ڈاکٹر محمد حسین کا "د ترکی سفرنامه" (ترکی کا سفرنامہ) بھی اس صنف میں قابل قدر اضافے ہیں۔

اس دور میں کچھ لکھاریوں نے حج کے سفرنامے بھی لکھے جن میں کچھ تو قیام پاکستان سے

پہلے کے دور میں لکھے گئے اور چند سفرنامے ایسے بھی ہیں جو قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے۔ سفرناموں میں سیدہ قانتہ بیگم کا ''د حجاز سفر'' (سفرِ حجاز) معیار کے لحاظ سے قابلِ قدر سفرنامہ ہے جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اسی طرح حکیم عبدالوھاب کا زما د حج سفر (میرا حج کا سفر)، میاں عبدالرحمن لوگے کا کاتیل کا حجازی مسافر، قند حارۃ فریدی کا ''زما د حج سفر'' (میرا حج کا سفر) اسرار عودی کا د حج مجموعہ سفر او د حج مسئلی (حرمین کا سفر اور حج کے مسائل) اور سید جعفر حسین شاہ درشتہ نے کا سفرنامہ حج، قابلِ ذکر حج کے سفرنامے ہیں جن کو حج نامے بھی کہا جا سکتا ہے۔

حج ناموں یا حج کے سفرناموں کے علاوہ مجموعی طور پر پشتو میں سفرنامہ نگاری کی روایت زیادہ مستحکم ہے اور پھر قیام پاکستان کے بعد پشتو سفرنامے کا سفر تو انتہائی سست روی کا شکار رہا ہے۔

اگر ہم بیسویں صدی میں سفرنامہ نگاری کی جدید روایت کو دیکھتے ہوئے پشتو میں سفرناموں پر نظر ڈالیں اور قیام پاکستان سے پہلے کے چند معیاری سفرناموں کو بھی مدنظر رکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ :

پشتو میں اگرچہ سفرناموں کا سفر زیادہ طویل نہیں لیکن میاں اکبر شاہ بدرشوی، عبدالاکبر خان اکبر، امیر حمزہ شنواری، طاہرؔ آفریدی اور افضل شوق کے سفرناموں کو دیکھ کر پشتو میں سفرنامہ نگاری کے فنی اور فکری ارتقاء کے نقوش با آسانی واضح ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ایوب صابر پشتو میں سفرنامہ نگاری کے معیار سے زیادہ مطمئن نہیں مگر پھر بھی میاں اکبر شاہ بدرشوی اور امیر حمزہ شنواری نے سفرنامہ نگاری کے ابتدائی دور میں جو معیار بنایا تھا بعد میں طاہرؔ آفریدی اور افضل شوق نے اس میں خاصا اضافہ کیا۔ ایوب صابر رقم طراز ہیں:

''جدید دور میں اچھے سفرنامے امیر حمزہ شنواری اور محمد نواز طائر نے لکھے ہیں مگر ان میں سے ایک سفرنامے کا معیار بھی اتنا اونچا نہیں جتنا اردو میں اختر ریاض الدین کے ''سات سمندر پار'' اور ''دھنک پر قدم'' محمد تقائی کے سفرنامے اور ابن انشاء کے ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' وغیرہ کا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پشتون ادیبوں کی روایتی قدامت پسندی پشتو سفرناموں پر اب بھی حاوی ہے اور لے دے کر محمد نواز طائر ہی ایک ایسے نوجوان اہلِ قلم ہیں جن کے سفرنامے میں جدید طرزِ فکر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مگر ان کے سفرناموں کی افادیت اس اعتبار سے میاں اکبر شاہ، عبدالاکبر خان اکبر اور امیر حمزہ شنواری کے سفرناموں سے کم ہے۔ انہوں نے ہمیں پاکستان کے ایک حصے کی سیر کرائی ہے جبکہ میاں اکبر شاہ، عبدالاکبر خان اکبر اور حمزہ شنواری نے روس، کابل، ایران، عراق، کویت اور سعودی عرب کی سیر

کرائی ہے۔ مگر ایک بات ہے محمد نواز طائر نے اپنے سفرنامے 'تالیدے سوات'' (تا دیدہ یا ان دیکھا سوات) میں سوات کے ان گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جو عام لوگوں اور سیاحوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں اور اس سفرنامے میں محمد نواز طائر کا انداز بیان بڑا جاندار، شگفتہ اور دلچسپ ہے(۵۶)۔

پشتو میں سفرنامہ نگاری کی اس سست روی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی اور پھر اکیسویں صدی میں الیکٹرانک میڈیا کے غلبے نے سفرنامہ نگاری کی روایت کو مزید متاثر کیا ہے۔ سفرنامہ جس دور میں کسی ملک یا خطے کی تہذیبی پس منظر، علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی منظرنامے کو سمجھنے میں جو مدد کرتا تھا آج انٹرنیٹ کی دنیا میں وہ کام چند گھنٹوں بلکہ منٹوں میں کرتا ہے۔ مگر پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامہ محض معلومات کا ذخیرہ جمع نہیں کرتا بلکہ اس میں لکھنے والے کے دلکش اسلوب کا کمال بھی ہوتا ہے، اس لئے آج کے انٹرنیٹ کے دور میں بھی سفرنامے لکھے جا رہے ہیں اور مستقبل میں بھی لکھے جائیں گے۔ یہی صورت حال پشتو سفرناموں کی بھی ہے۔ لہذا قیام پاکستان کے بعد پشتو میں لکھے گئے سفرناموں کو بھی اپنے اسلوب اور پیرایہ اظہار کی بدولت خاطر خواہ اہمیت دی جا سکتی ہے۔

☆☆☆

رپورتاژ نگاری

رپورتاژ نگاری کی صنف اگرچہ ادب میں زیادہ قدیم نہیں مگر پھر بھی پشتو میں اس صنف ادب کے آثار قدیم زمانے سے ملتے ہیں۔ بنیادی طور پر رپورتاژ کی اصطلاح صحافتی ہے جو فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں یہی رپورتاژ Reportage بنا ہے جس میں بنیادی جز وہی صحافتی رپورٹ Report ہے۔ اسی صحافتی رپورٹ سے ادب کا رپورتیج (Reportage) اور معروف اصطلاح میں رپورتاژ بنا ہے جو تمام مشرقی زبانوں میں بھی اسی نام سے موسوم ہے۔

پشتو ادب میں رپورتاژ کے ابتدائی آثار خوشحال خان خٹک کے "بندو کو دہ نامہ" میں ملتے ہیں جس پر کہیں کہیں سفرنامہ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے جدید پشتو ادب میں بھی خان عبدالغفار خان اور کاکاجی صنوبر حسین کی کئی تحریروں میں رپورتاژ کے نقوش واضح طور پر نظر آتے ہیں مگر پشتو میں صحیح معنوں میں باقاعدہ ادبی رپورتاژ نگاری کا آغاز قیام پاکستان کے بعد ہوتا ہے۔ نامور نقاد و محقق ایوب صابر نے اپنی کتاب "جدید پشتو ادب" میں اس صنف کا ایک اجمالی خاکہ یوں پیش کیا ہے۔

"پشتو ادب کا دامن جہاں ادب کی دیگر اصناف سے بھرا پڑا ہے وہاں اس میں اچھی رپورتاژ کی بھی کمی نہیں ہے۔ اگرچہ اس میدان میں اچھی اور بھرپور کوشش ۱۹۴۸ء کے بعد ہی ہوئی ہیں تاہم پشتو ادب کا یہ حصہ شکاست میں اتنا کم نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلے جس رپورتاژ کو پیش کیا جا سکتا ہے وہ نصر اللہ خان نصر مرحوم کا "دادب سفر" (ریاست ادب کا سفر) ہے جس کا انداز بیان مورخانہ زیادہ ہے اور رپورتاژ کے تقاضے کم پورے کرتا ہے۔ یہ دراصل ایک یادداشت ہے جو نصر صاحب اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ ریاست کے نواب فرید خان کے حسن سلوک اور مہمان نوازی پر روشنی ڈالتی ہے۔

پشتو کا پہلا اچھا اور بھرپور رپورتاژ اجمل خٹک کا "دا زہ پاگل وم" (کیا میں پاگل تھا) ہے اس رپورتاژ میں ایسے کئی مقامات آتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر قارئین کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اسیری کے ایام میں اجمل خٹک کو جن اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا یہ

رپورتاژ ان کی دل دہلا دینے والی داستان ہے اور اس کو ابراہیم جلیس کی کتاب "جیل کے دن جیل کی راتیں" سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔

ایسا ہی ایک رپورتاژ بخش جلیل کا "قید و بند" بھی ہے اور یہ تاثر کے اعتبار سے پشتو ادب کا سب سے اونچا رپورتاژ ہے۔

"قرا صحاب بابا" (اصحاب بابا کے مزار تک) مہدی شاہ مہدی کا رپورتاژ ہے جس میں پشتونوں کے توہمات اور بزرگان دین کے مزاروں کے ساتھ غیر شرعی اور غیر اسلامی عقائد کو عالمانہ نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔

رشید علی دہقان کا "ما په کن ښکارو سترګو دا هر څه لیدلي دي" نے یہ سب کچھ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے بھی اس میدان میں ایک اچھی کوشش ہے۔

(دہلی کہ سفر وطنہ کہ سفر) حسن خان سوز کا ایک دلچسپ رپورتاژ ہے جس میں تاریخی جھلکیاں بڑے شگفتہ انداز میں دکھائی گئی ہیں "ملکہ" وہ مقام ہے جہاں شاہ اسمٰعیل شہید کے مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر تھا یہ "ستمبر" میں مہابن پہاڑ کے دامن میں واقع ہے حسن خان سوز کی ساری رپورتاژ میں تاریخی جھلکیوں کی ویسی ہی فراوانی ہے جیسے دوست محمد خان کامل کے انشائیہ "تبصرہ" میں ہے۔

"پشتو ابھی ختم نہیں ہوئی" قمر راہی کا رپورتاژ ہے اس میں فن اور معیار کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے اور یہ طنزیہ چٹکیوں سے بھرا پڑا ہے۔

دتیراہ سفر (کوہستان تیراہ کا سفر) اور پیاورہ تخت بھائی پورے (پشاور سے تخت بھائی تک) محمد لطیف وہمی کے رپورتاژ ہیں۔ موخر الذکر رپورتاژ روزنامہ بانگ حرم پشاور میں نصف ہی چھپا تھا کہ راقم الحروف کو اس کی اشاعت روکنی پڑی۔ کیونکہ اس میں وہمی صاحب نے پشتو کے ایک نہایت ہی قابل احترام شاعر کو جابجا تضحیک کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

راقم الحروف نے بھی پشتو ادب میں "کوہات نه تر لوړ والائي پورې" (کوہاٹ سے لورالائی تک) "اتمه دا خیله پلور" (اضاخیل نوشہرہ کی طرف) جیسے رپورتاژوں کا اضافہ کیا ہے اور ان میں شعوری طور پر وہی رنگ اپنانے کی کوشش کی ہے جو اردو میں کرشن چندر کے مشہور رپورتاژ پودے کا ہے۔

اس مختصر خاکہ کو اگر مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے تو پشتو میں رپورتاژ نگاری کی

روایت کی مزید وضاحت ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت میں ایوب صابر کے اس اجمالی خاکے سے مزید استفادہ کرتے ہوئے مختلف رپورتاژوں پر اُن کا تجزیہ الگ الگ بھی پیش کیا جا سکتا ہے جیسے اجمل خٹک کے رپورتاژ "دا زہ پاگل وم" (کیا میں پاگل تھا) اور ہمیش خلیل کے "قید و بند" کی صابر مرحوم نے بہت زیادہ ستائش کی ہے۔

اجمل خٹک کے "دا زہ پاگل وم" (کیا میں پاگل تھا) کو پشتو کا بہت معیاری اور اہم رپورتاژ تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ دو سو ساٹھ صفحات پر مشتمل پہلی بار 1958ء میں شائع ہوا تھا جو اجمل خٹک کی قید و بند کی زندگی کے تلخ ایام کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان اور واقعات کو پیش کرنے کا ڈھنگ انتہائی دلچسپ اور متاثر کن ہے۔ ایوب صابر نے اس رپورتاژ کے بارے میں لکھا ہے۔

"پشتو کا پہلا اچھا اور بھرپور رپورتاژ اجمل خٹک کا 'دا زہ پاگل وم' (کیا میں پاگل تھا) ہے اس رپورتاژ میں ایسے کئی مقامات آتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر قارئین کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اسیری کے ایام میں اجمل خٹک کو جن اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا یہ رپورتاژ ان کی دل دہلا دینے والی داستان ہے اور اس کو ابراہیم جلیس کی کتاب "جیل کے دن جیل کی راتیں" سے مشابہت دی جا سکتی ہے(۵۸)۔

ہمیش خلیل نے "قید و بند" کے نام سے اپنی اسیری کے حالات و واقعات کو قلمبند کر کے رپورتاژ کی صنف میں پیش کیا ہے جو تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ ہمیش خلیل کا یہ رپورتاژ بھی مجموعی تاثر اور معیار و کیفیت کے لحاظ سے اجمل خٹک کے مذکورہ بالا رپورتاژ سے ملتا جلتا ہے۔

یہ بھی واضح ہو کہ خدائی خدمتگار تحریک سے وابستہ ادبی لوگوں میں ہمیش خلیل نے سب سے زیادہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور اپنی زندگی کے تقریباً نو سال کا مجموعی عرصہ جیل کی سلاخوں کی نذر کر چکے ہیں۔ اس دوران انہوں نے قید و بند کی زندگی کا بنظر غائر مشاہدہ کیا ہے اور پھر اس کو رپورتاژ کی صنف میں قلمبند کیا ہے۔ ایوب صابر نے اس رپورتاژ کے بارے میں لکھا ہے:

"ایسا ہی ایک رپورتاژ ہمیش خلیل کا قید و بند بھی ہے اور یہ تاثر کے اعتبار سے پشتو ادب کا سب سے اونچا رپورتاژ ہے(۵۹)۔

صدیق اللہ رشتین کا "د پښتو تاريخي سيمينار" (پشتو کا تاریخی سیمینار) 1987ء میں یونیورسٹی بک ایجنسی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ یہ رپورتاژ بازہ گلی سمر کیمپ میں پشاور

یونیورسٹی کے اہتمام سے منعقدہ پشتو، اسلامیات اور جغرافیہ کے شعبہ جات کے مشترکہ سیمینار کی روداد بیان کرتا ہے۔اس سیمینار میں پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان کے علاوہ افغانستان سے پانچ دانشوروں کو مدعو کیا گیا تھا جس کا افتتاح یونیورسٹی کے وائس چانسلر محمد علی نے کیا تھا اور تعارفی کلمات ناصر و داشور سودہ تا عبدالقادر نے پڑھے تھے۔ یہ رپورتاژ آسان رواں اور سلیس انداز میں واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے۔اس دور کے دیگر رپورتاژوں کے بارے میں ایوب صابر نے لکھا ہے:

"دملکہ سفر (ملکہ کا سفر) حسن خان سوز کا ایک دلچسپ رپورتاژ ہے جس میں تاریخی جھلکیاں بڑے شگفتہ انداز میں دکھائی گئی ہیں۔ "ملکہ" وہ مقام ہے جہاں شاہ اسمٰعیل شہید کے مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ بونیر میں "مہابن" پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ حسن خان سوز کے اس رپورتاژ میں تاریخی جھلکیوں کی ویسی ہی فراوانی ہے جیسی دوست محمد خان کامل کے انشائیہ "تجربہ" میں ہے۔

"پشتو ابھی ختم نہیں ہوئی" قمر راہی کا رپورتاژ ہے اس میں فن اور معیار کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے اور طنزیہ چٹکیوں سے بھرا پڑا ہے۔

دتیراہ سفر (کوہستان تیراہ کا سفر) اور پیښور نه تخت بھائی پورې (پشاور سے تخت بھائی تک) محمد لطیف وہمی کے رپورتاژ ہیں۔ مضمون اللہ کرر پورتاژ روزنامہ، شہباز ترجمان پشاور میں نصف ہی چھپا تھا کہ راقم الحروف کو اس کی اشاعت روکنی پڑی۔ کیونکہ اس میں وہمی صاحب نے پشتو کے ایک نہایت ہی قابل احترام شاعر کو بے جا تنقید و تضحیک کا نشانہ بنایا تھا" (۹۰)۔

پشتو کی جدید رپورتاژ نگاری کو طاہر آفریدی کے "جانان مې قطر ته روان دے" (میرا محبوب قطر جا رہا ہے) نے تحریک دے دی۔ طاہر صاحب کا یہ رپورتاژ قطر میں سکونت پذیر پشتون ادیبوں کی منعقدہ ادبی تقریبات کی روداد پر مشتمل ہے جس میں طاہر آفریدی نے جا بجا اپنی دلکش تحریر اور منفرد اسلوب بیان کا مظاہرہ کیا ہے۔اس رپورتاژ کی تحریک سے پشتو میں رپورتاژ نگاری کا رجحان زیادہ ہو گیا۔ محمد زبیر حسرت نے ایک تفصیلی رپورتاژ "له مردانه تر مردانه" (مردان سے لے کر مردان تک) کے نام سے لکھا۔ "خه چې حو کابل ته" (آؤ کابل چلیں) طاہر آفریدی کا ایک اور دلچسپ رپورتاژ ہے جو کابل میں اجمل خٹک کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے منعقدہ سیمینار کی کاروائی پر مشتمل ہے۔اس رپورتاژ پر بھی سفرنامے کی چھاپ نظر آتی ہے لیکن ساتھ ساتھ مصنف کے منفرد اسلوب اور شگفتہ طرز تحریر نے اس کی دلچسپی میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ پشتو رپورتاژ

نگاری کے ذخیرہ میں سلیم راز کا "لہ باڑے نہ تر باڑہ گلی" (باڑہ سے باڑہ گلی تک) کئی حوالوں سے ایک نادر اضافہ ہے۔ سلیم راز بیک وقت صحافت اور ادب کا وسیع تجربہ اور مطالعہ رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے صحافت اور ادب کے بین بین پیدا ہونے والی صنف رپورتاژ کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ رپورتاژ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے اہتمام سے یونیورسٹی کے باڑہ گلی سمر کیمپ میں منعقدہ تقریب کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس رپورتاژ میں ایک طرف تو سلیم راز کی نظریاتی اساس اور طرزِ فکر کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف پشتو اکیڈمی اور پشتو زبان و ادب سے متعلق دوسرے ادارے مصنف کی کڑی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ پشتو کے کئی ادیبوں اور سیمینار کے شرکاء کے قلمی خاکے بھی کھینچے گئے ہیں۔ جس میں انہوں نے اپنی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ پشتو رپورتاژ نگاری کے میدان میں سلیم راز کا یہ رپورتاژ ایک معتبر حوالہ اور نہایت ہی اہم اضافہ ہے۔

بلوچستان کے شاعر اچکزئی کا "کتلے خواب" (دیکھا ہوا خواب) اور اسرار طور کا "د کابل سفر" (سفرِ کابل) بھی اس صنف میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ رپورتاژ نگاری کا یہ رجحان اتنا عام ہو گیا ہے کہ اب مختلف ادباء اپنے مختصر مختصر سے ہوئے رپورتاژوں کے مجموعے بھی شائع کرنے لگے ہیں۔ طاہر آفریدی نے اپنے تین رپورتاژ ایک مجموعہ کی صورت میں "لاڑ شہ پیور رد" (چلو پشاور کی سیر کرو) کے نام سے اگست 2005ء میں شائع کیا ہے جس میں پہلا رپورتاژ بلوچستان میں ادبی تقریب (عالمی پشتو ادبی سیمینار منعقدہ 11، 12 اکتوبر 2003ء) پشتو ادبی غورزنگ کے نام سے، دوسرا رپورتاژ اسلام آباد تہ کئی (اسلام آباد کے رستے میں) اور تیسرا رپورتاژ لاڑ شہ پیور رد شامل کر دیے گئے ہیں۔ تینوں رپورتاژوں میں تحقیقی رنگ اور شگفتہ تحریر کا انداز نمایاں ہے۔ رپورتاژوں کا ایک اور مجموعہ "د یاگرامہ تر بولانہ" (یاگرام سے لے کر بولان تک) کے نام سے حاجی شمس الدین مخلص درانی نے لکھا ہے۔ اس مجموعہ "تلل باڑہ گلی تہ" (باڑہ گلی کو آنا جانا)، "د یاگرامہ تر بولانہ" (یاگرام سے لے کر بولان تک)، "بیا یو ځل باڑہ گلی تہ" (ایک دفعہ پھر باڑہ گلی میں) کے نام سے رپورتاژ شامل کر دیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ جولائی 2005ء میں منظر عام پر آیا۔ مخلص درانی افسانہ اور رپورتاژ کے منجھے ہوئے تجربہ کار اہلِ قلم ہیں۔ ان کے تمام رپورتاژوں میں واقعات کی تصویر کشی اور معلومات کا ذخیرہ بڑی مہارت سے دیا گیا ہے۔

"ښکلی دے وطن زما" (میرا ہے وطن میرا) صابر شاہ صابر کا سات رپورتاژوں پر مشتمل مجموعہ ہے جو اپریل 2004ء میں شائع ہوا ہے اسی طرح اُن کے ایک اور مجموعے "جنازے" (جس

میں پشتون اہل قلم کے جنازوں کی روداد قلم بند کی گئی ہے) میں شامل تحریروں پر بھی رپورتاژ کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ صابر کا ایک رپورتاژ "دتیراہ سفر" (سفر تیراہ) حال ہی میں شائع ہوا ہے جس میں خصوصی طور پر عجب خان آفریدی کے مس ایلیس کو اغوا کرنے کا واقعہ اور دیگر معلومات قلمبند کی گئی ہیں۔

پرانے رسائل و جرائد کی فائلوں کو اگر دیکھا جائے تو بیسوں رپورتاژ مختلف ادیبوں کے لکھے ہوئے نظر آئیں گے جیسے ماہنامہ اسلم میں کاکاجی صنوبر اور اس دور کے دیگر ادیبوں کی رپورتاژ، صدیق اللہ رشتین، اجمل خٹک، مہدی شاہ مہدی، لطیف وہمی وغیرہ رپورتاژ کے وہ لکھاری ہیں جن کے مختصر رپورتاژ مختلف مجموعوں میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ اجمل خٹک کے کئی رپورتاژ جیسے زہ د خارجی ملکونو د مطالعی یادرنہ (میرے خارجی ممالک کے مطالعے کا ایک رخ)، گلونہ غونڈہ (پھولوں کا حصول)، د کورنہ تر گورہ (گھر سے لحد تک)، باچا خان سہ وئیل (باچا خان نے کیا کہا) وغیرہ ہفت روزہ پختون پشاور اور ماہنامہ رہبر کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح پشتو کے چند لکھاریوں نے مختلف ادبی تقریبات اور دیگر واقعات کے رپورتاژ لکھے ہیں جو مختلف جرائد و اخبارات میں بکھرے پڑے ہیں۔ رپورتاژ کے لکھنے والوں میں شمس درانی اور طاہر آفریدی وہ لکھاری ہیں جو آج تک تواتر سے اس صنف میں اضافہ کر رہے ہیں۔

پشتو میں رپورتاژ کا یہ سفر بیسویں صدی کے اختتام تک پوری شدت کے ساتھ جاری رہا اور کئی نامور ادیبوں نے اس صنف میں قابل قدر اضافے کیے۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے اب تک چند نوجوان ادیبوں نے بھی پشتو میں معیاری رپورتاژ لکھے جن میں سے چند رپورتاژوں کا تذکرہ افغانستان کے محقق محمد داؤد وفا نے اپنی کتاب پشتو کے معاصر ادب کی تاریخ میں کیا ہے۔ ۲۰۰۰ء کے بعد شائع شدہ چند رپورتاژوں کا تذکرہ ہم یوں کرتے ہیں۔

جانان می قطر ته روان دی: طاهر آفریدی، ۲۰۰۳م، کراچی
بنګلی دی وطن زما: سید صابر شاه صابر ۲۰۰۴م، پېښور
له باری تر باره ګلی: سلیم راز، ۲۰۰۴م، پېښور
د سپین بولدک په لور: حنیف خلیل ۲۰۰۵م، پېښور
لارشه پېښور ته: طاهر آفریدی۲۰۰۵م، کراچی
خه چی خو کابل ته: طاهر آفریدی ۲۰۰۱م، پېښور

له مردانه تر مردانه: زوبیر حسرت ۲۰۰۶م، پیښور

دوه لوی سفرونه: سید صابر شاه صابر ۲۰۰۷م، پیښور

هنګو په اور کې: ناصر قریشی ۲۰۰۸م، پیښور

د کابل سفر: اسرار دطورو، ۲۰۰۸، پیښور

دیا ګرامه تر بولانه: شمس الدین منلس درانی ۲۰۰۸م، پیښور

بېډه نمبر ۲۸: ریاض تسنیم، ۲۰۱۲م، پیښور

دیاره کلی د کوحی مازیګر: ګوهر رحمان نوید ۲۰۱۵م، پیښور

پښتانه بیا پښتانه دی: طاهر بونیری ۲۰۱۵، پیښور

بخشالی وی جلال اباد ته به حو: م۔ر۔شلق ۲۰۱۶م پیښور

دلورلایی په لور: نور قاسم قاسم ۲۰۱۶م پیښور (۹۱)

مذکورہ باقاعدہ رپورتاژوں کے علاوہ کچھ ایسی تحریریں بھی موجود ہیں جن پر رپورتاژ کے اثرات ہیں مگر وہ باقاعدہ رپورتاژ نہیں ہیں۔ اس قسم کی تحریروں میں وہ روداد یں بھی شامل ہیں جو مختلف ادوار میں مختلف ادبی تنظیموں اور ادبی جرگوں کی کاروائیوں پر مشتمل ہیں۔ اس قسم کی رودادوں میں اولسی ادبی جرگہ، سا حو لیکونکیو کی ادبی پوہنوں، جرس ادبی جرگہ اور کئی دیگر ادبی تنظیموں کی رودادوں کے علاوہ کچھ تحریریں ایسی بھی ملتی ہیں جو انشائیہ اور مضامین کی نیت سے لکھی گئی ہیں یا نثر میں معاشرتی مسائل اور طنز و تنقید کے ارادے سے لکھی گئی ہیں مگر ان پر بھی رپورتاژ کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس قسم کے تحریروں سے عبداللہ جان مظلوم کے "خوازہ تراخہ" (تلخ و شیریں) کے نام سے مطبوعہ کتاب میں کئی مختصر تحریریں رپورتاژ کا اثر لئے ہوئے ہیں۔ سید تقویم الحق کاکا خیل کا "دسیلانی روز نامچہ" (سیاح کا روز نامچہ) بھی اسی انداز کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ کاکا خیل مرحوم کی اس قسم کی تحریروں میں سے ایک پشتو تحریر کا اردو ترجمہ جو ڈاکٹر ہمایوں ہما نے کیا ہے، پیش خدمت ہے۔

اجنبی پر اعتبار:

ایک مدت بعد لاہور کی ریل میں روانہ ہوا۔ دوستوں نے ایک عام ڈبے میں بٹھا دیا یہ عام ڈبہ بھی کراچی سے آیا تھا اور اس میں ہر شخص نے جگہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ سب لوگ ایک دوسرے پر

ایسے لدے ہوئے تھے جیسے کسی نے سیمنٹ کی بوریاں گاڑی کر رکھی ہوں۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ چپکے بیٹھے۔ بیٹھے لوگوں کو کھڑے ہونے کا یارا نہ تھا اور کھڑے لوگوں کو بیٹھنے کی ہمت نہ تھی۔ جو بھی اترتا تو اسے دوسرے پر پاؤں رکھنے پڑتے اور یا پھر کاندھوں پر سے گزرنا ہوتا اور جو چڑھنا چاہتے تو اُن کی ہمت تھی کہ وہ کس کو بچاتے۔

دم لے کر میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ گاڑی کے ساتھ دو مسافر ایک دوسرے کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے اور ان کے ساتھ مٹھائی رکھی تھی اور وہ بھی یوں کہ ان کی ٹانگیں ایک دوسرے کے ساتھ لگی تھیں جن سے وہ میز کا کام لے رہے تھے یا ایک ٹکڑا مٹھائی کو منہ میں رکھتے اور ساتھ ہنس بھی رہے تھے۔

مٹھائی کے دانے سرخ اور سفید رنگ کے تھے۔ مزید اس میں کچھ فرق نہ تھا۔ ان دونوں آدمیوں کی شکل و صورت میں بھی کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ بھورے رنگ کے کپڑے پہنے ایک آدمی لیڈنگ کر رہا تھا۔ جسم پر ابھرا ابھرا گوشت جیسے نیا لیپ چڑھا ہوا ہو۔ اس کی قمیض میں کھلی جیب تھی جو پھولی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اس کے پیٹ بھی کوئی چیز ہو۔ شکل و صورت سے کچھ زیادہ عمر کا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے بوسکی کی قمیض پہن رکھی تھی۔ مضبوط جسم کا خوش شکل آدمی تھا۔ ہنس مکھ تھا۔ لہجے میں بے تکلفی تھی اور دلچسپ گفتگو کر رہا تھا۔ دونوں الگ الگ ماحول کے لگ رہے تھے۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے کی باتوں میں یوں غرق تھے کہ نہ تو انہیں کچھ نظر آ رہا تھا اور نہ کسی کی باتیں سن رہے تھے۔

ان سے کچھ فاصلے پر مجھے دس پندرہ آدمی نظر آئے۔ دو دو ایک سیٹ کے آخری سرے پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا خاکی رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھی اور اس کے سر پر تہہ در تہہ ہونٹوں سے چلم کی پکڑ رکھی تھی۔ چلم دوسرے لوگوں کی اوٹ میں پڑی تھی۔ اس کے منہ میں وقفے وقفے سے دھواں خارج ہو رہا تھا لگتا تھا کہ پانی اور آگ رستی ہو۔

ہر شخص کسی نہ کسی کام میں مشغول تھا کوئی کسی سے باتیں کر رہا تھا کسی نے اخبار یا رسالے پر آنکھیں جما رکھی تھیں کوئی کسی سوچ میں ڈوبا تھا۔ کسی نے آنکھیں کھول رکھی تھیں تو کسی نے بند کی ہوئی تھیں۔ کوئی باہر درختوں اور ویرانے کو تاک رہا تھا اور کوئی سیاہی کو گھور رہا تھا۔

دو دو آدمی جیسے اب باتیں کرنے سے تھک گئے ہوں اس سادہ، عمر رسیدہ شخص نے آنکھیں بند کی تھیں۔ سر اس کا آگے کی طرف جھول رہا تھا جیسے سو گیا ہو اور نیند میں مست تھا۔ جیسے اپنی محفل کی

باتوں سے لطف لے رہا ہو۔ نوجوان آدمی جاگ رہا تھا اور ہرن کی طرح گردن اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں گاڑی ایک اسٹیشن پر رک گئی۔ باہر سے ایک ہجوم ٹوٹ پڑا۔ دروازے کو ایسا جھٹکا لگا کہ دس بارہ آدمی اچانک دس بارہ آدمیوں پر گر پڑے۔ اور ان کی وجہ سے آٹھ دس مزید لوگوں کو دھکا کھانا پڑا۔ بوڑھے کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کے انگارے کسی کی جھولی میں پڑے اور کسی کے پاؤں میں بکھر پڑے۔ ایک افراتفری مچ گئی، ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگ چیخنے چلانے لگے اور پھر گاڑی روانہ ہو گئی۔ لوگوں نے اپنی چیزیں سنبھالیں اور سب کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی۔ وہ چندھی بجھی بجھی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا وہ میرا ساتھی؟ میں نے کہا "اتر گیا ہوگا" آ جائے گا۔ اتنے میں اس کا ہاتھ اپنے پیٹ پر لگا۔ "وئی" کی آواز اس کے منہ سے نکلی اور اپنی قمیض الٹ کر دیکھی۔ قمیض کے نیچے اس نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔ نیلی سفید جیکٹ، ہلکی ہلکی، سادہ دہقان کی طرح۔ آدمی نے ایک چیخ ماری۔ ہائے میری نقدی۔ میری جیب میں تو دو ہزار روپے تھے میری رقم، وہ میرا ساتھی، میں نے کہا تمہاری نقدی مٹھائی کھا گئی۔ ساتھی کو پہچانتے تھے۔ کہا نہیں لاہور سے میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تھا۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا تھا، شریف آدمی لگ رہا تھا۔ بے فکر ہو جاؤ۔ میں نے کہا وہ بھاگ گیا ہے اب نہیں آئے گا۔ لگتا ہے اس نے مٹھائی میں کوئی چیز ڈال رکھی تھی۔ وہ سفید مٹھائی کے دانے کھاتا رہا اور تم دونوں پر ہاتھ صاف کرتا رہا، کہنے لگا کس کا فکر کو اس کی بات کی فکر تھی۔ میں نے کہا ان دو ہزار روپوں سے تمہیں یہ سبق تو ملا۔ آئندہ کے لئے کوئی اجنبی، جوان، تم سے چکنی چپڑی باتیں کرنے لگے تو ایک ہاتھ جیب پر رکھ دیا کرو۔ اس کی باتیں مفت میں نہیں ہوتیں (۶۴)۔

پشتو میں رپورتاژ نگاری کا یہ سفر جاری ہے۔ کئی نامور ادیب اس صنف میں اضافے کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسرار نے پشاور یونیورسٹی کے شعبہ پشتو سے "پشتو میں رپورتاژ نگاری" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لی ہے۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے ادیبوں کے علاوہ افغانستان کے ادیب بھی اس صنف میں مسلسل اضافے کر رہے ہیں مگر ہمارا موضوع خصوصی طور پر قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں پشتو رپورتاژ نگاری کا سفر واضح کرنا تھا جس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کر دیا گیا۔

☆☆☆

انشائیہ نگاری

انشائیہ کی صنف کے لئے پشتو میں "ټکل" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ انشائیہ کے لئے یہ نام اولسی ادبی جرگہ کے اکابرین و ناقدین نے متعین کیا تھا جس میں دوست محمد کامل مرحوم کا نام پہلے نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ دوست محمد کامل نے پشتو میں نہ صرف بلند معیار کے انشائیے لکھے ہیں بلکہ انشائیہ کے لئے "ټکل" کی اصطلاح وضع کرنے کا سہرا بھی اُن ہی کے سر ہے۔ ټکل خالص پشتو زبان سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے کوشش کرنا اور اردو میں انشائیہ کا مطلب بھی لکھنا یا لکھنے کی کوشش کرنا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے پشتو میں انشائیہ نگاری یا ټکل نگاری کی باقاعدہ روایت نظر نہیں آتی البتہ بیسوی صدی کے آغاز میں مولوی احمد، منشی احمد جان اور میر احمد شاہ رضوانی کی طبع زاد نثری تحریروں میں داخلی عناصر کی موجودگی اور موضوعی طرز فکر کی وجہ سے ان نثروں میں کہیں کہیں انشائیہ جیسا انداز ضرور جھلکتا ہے۔ اس لئے پشتو کے کچھ ناقدین و محققین یہ کہتے ہیں کہ پشتو میں انشائیہ کا وجود اردو سے بھی پہلے موجود ہے۔

فرانس میں مونٹین اور انگلینڈ میں فرانسس بیکن نے جو مضامین لکھے ہیں، ناقدین نے ان کو انشائیہ کہا ہے۔ اس طرح اردو میں کئی لکھنے والوں خصوصی طور پر ڈاکٹر وزیر آغا اور مشکور حسین یاد نے انگریزی کے تاثر میں انشائیے لکھے۔ لیکن پشتو کا معاملہ واقعی کچھ اور ہے۔ انشائیہ کی تعریف میں بنیادی بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہ موضوعی ہوگا۔ داخلی تاثرات پر مشتمل ہوگا اور لکھنے والے کے نفسیاتی محرکات کے ساتھ ساتھ کسی بھی موضوع پر اس کی ذاتی معلومات اور منفرد اسلوب کی نشان دہی کرے گا۔ ان باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے مضامین اور انشائیے، بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں بھی موجود ہیں حتیٰ کہ مولوی احمد اور منشی احمد جان کی نثروں میں بھی داخلی تاثرات اور اسلوب کی انفرادیت کا رنگ جھلکتا ہے لیکن انشائیہ یا ټکل کی جدید شکل تب سے نمودار ہونے لگی جب سے اولسی ادبی جرگہ کے شرکاء نے 31 جنوری 1955ء کی ایک نشست میں اس صنف کا نام ټکل رکھا اور اس کے خدوخال واضح

کیے۔ مذکورہ اجلاس میں جب افغانستان کے عبدالحئی حبیبی نے اپنی نثری تحریر "آزادی کوم خائے دہ" (آزادی کہاں ہے) تنقید کیلئے پیش کی تو سب سے پہلے اس تحریر کے صنفی تعین پر گفتگو ہوئی۔ لطیف وہبی قلندر مومند، مہدی شاہ مہدی نے اس تحریر کو ادبِ لطیف کہا ہے لیکن دوست محمد کامل نے انشائیہ کے خدوخال واضح کرتے ہوئے اس کو انشائیہ کہا اور انشائیہ کے لئے پشتو میں "ٹکل" کا نام تجویز کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک پشتو میں انشائیہ کو "ٹکل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پشتو میں اس صنف کے تعارف کا سہرا بیشتر لکھنے والوں نے کاکاجی صنوبر حسین اور راحت زاخیلی کے سر باندھا ہے لیکن ہونے کے طور پر کسی انشائیہ کو پیش نہیں کیا۔ یہ بعید از قیاس نہیں کہ پشتو میں سب سے پہلے جدید انشائیے کاکاجی صنوبر حسین اور راحت زاخیلی نے لکھے ہوں لیکن اس کے لئے پرانے رسائل و جرائد کی فائلیں دیکھنا پڑیں گی۔ جہاں تک کاکاجی صنوبر حسین مومند کا تعلق ہے تو ان کے مجلے ماہنامہ اسلم کے تمام شماروں کی فائل میرے پاس موجود ہے۔ "اسلم" کے شماروں میں کاکاجی صنوبر کے سفرناموں، رپورتاژوں اور دیگر مضامین و مقالات کے ساتھ ساتھ کئی انشائیے بھی شامل ہیں۔ ان کے انشائیوں میں "د پښتون بیالی او خودداری" (پشتون کی خودداری) "خوږونه" (خصلتیں) "دبجتریانو حال" (عبقریوں کا حال) "صاحب دا دارے ملنګ یا لګ راوړه" (صاحب اس دفعہ تو نمک بھی لاؤ) "د عوام زور" (عوام کی طاقت) شامل ہیں۔ یہ تمام کے تمام ماہنامہ اسلم کے پہلے شمارے (ستمبر 1949ء) میں شامل ہیں۔ یاد رہے کہ پہلے شمارے کی تمام تر تحریریں کاکاجی صنوبر حسین کی اپنی تھیں سوائے مرتضیٰ شاہ کی ایک تحریر کے۔ اسی طرح فروری 1952ء کے شمارے میں "بیت او عبداللہ" کے عنوان سے کاکاجی صنوبر کا انشائیہ فنی اور فکری لحاظ سے بہت خوبصورت اور معیاری انشائیہ ہے۔ ایوب صابر نے اپنی کتاب "جدید پشتو ادب" میں ابتدائی دور کے جن انشائیہ نگاروں کے نام دیے ہیں ان میں سب سے پہلا نام عبدالخالق خلیق کا ہے۔ ایوب صابر رقم طراز ہیں:

"پشتو میں جن ادیبوں نے اس صنف کو پروان چڑھایا ان میں عبدالخالق خلیق، امیر حمزہ شنواری، ماسٹر عبدالکریم، دوست محمد خان کامل، مہدی شاہ مہدی، محمد اشرف مفتون، قلندر مومند، رشید علی دہقان، محمد لطیف وہبی، مجتش خلیل، مراد خان شنواری، رب نواز مائل، سلیم راز، شفقت شباب اور راقم الحروف شامل ہیں۔ اس ضمن میں اور تو اور مولانا عبدالقادر اور میاں احمد شاہ بیرسٹر جیسے قدامت پسند دانشوروں نے بھی قلم اٹھایا اور علی الترتیب "ڈاکو پیا" اور "آزادی کی بربادی" جیسے انشائیے لکھ ڈالے

۔اس کے علاوہ میاں احمد شاہ کا ''جرگہ اور جمہوریت'' بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔مگر میاں صاحب بزرگ لکھنے والوں میں ہیں اور ان کا رنگ تحریر قدیم اور روایتی ہے(۹۳)۔

عبدالخالق خلیق کے انشائیوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے:

''عبدالخالق خلیق صاحب کم لکھتے ہیں مگر چٹکیاں ایسی کرتے ہیں کہ لطف آ جاتا ہے۔ان کی تحریر میں شگفتگی اور ظرافت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔معاشرے پر نشتر زنی کرنے میں بڑے بے باک واقع ہوئے ہیں اور چونکہ خود بھی معاشرے کے ایک ذمہ دار فرد ہیں اس لئے پہلا وار اپنے آپ پر کرتے ہیں اور اپنے آپ پر وار کرنے میں ان کا مد مقابل سوائے سعد اللہ جان برق اور راقم الحروف کے اور کوئی نہیں۔حقیقت یہ کہ پشتو طنز و انشاء میں ہم تینوں کی بے رحمی ضرب المثل ہے اور ہم میں سے کوئی بھی کسی کو معاف نہیں کرتا۔

عبدالخالق خلیق کے دو انشائیے ''خلیق اور انقلاب زندہ باد'' بہت مشہور ہیں(۹۴)۔

میرے پاس مرحوم عبدالخالق خلیق کے مضامین کا ایک غیر مطبوعہ مسودہ موجود ہے جس میں سنجیدہ اور علمی مضامین اور شخصیات کے حالات اور کارناموں پر مدلل مضامین کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے انداز میں بہت خوبصورت اور شائستہ اسلوب بیان کے ساتھ چند مضامین بھی شامل ہیں جو خالص انشائیے ہیں جس کو انگریزی ادب والے ''لائٹ ایسے'' (Light Essay) یا پرسنل ایسے (Personal Essay) کہتے ہیں ۔ ان مضامین اور انشائیوں یا ٹکڑوں میں ''انگلش''، ''دیرش روپئی سن'' (تیس روپے سن)، دیو خط جواب (ایک خط کا جواب)، ''د بیا زمانہ ووٹ غواڑے'' (تم پھر مجھ سے ووٹ مانگنے آئے ہو)، زمونږ ډاکټران (ہمارے ڈاکٹر)، شکوہ و جواب (مہنگ بخار) اور صدارتی تقریر شامل ہیں۔

یہ انشائیے کچھ متفرق جرائد میں شائع بھی ہوئے ہیں۔عبدالخالق خلیق کے بعد پشتو کے اہم انشائیہ نگاروں میں مولانا عبدالقادر، امیر حمزہ شنواری، دوست محمد کامل، میاں احمد شاہ، ماسٹر عبدالکریم اور افغانستان کے لکھنے والوں میں عبدالحئی حبیبی، عبدالرؤف بینوا اور گل پاچا الفت کے نام زیادہ نمایاں ہیں ۔اسی دور میں رضا ہمدانی نے بھی انشائیہ نما مضامین لکھے ہیں لیکن ان کے مضامین پر سنجیدگی چھائی ہوئی ہے۔رضا ہمدانی کے اس قسم کے دو مضامین ان کی کتاب ''ستوری'' (ستارے) میں ''د سرو زرو چاڑہ'' (سونے کا خنجر) اور ''اسمانی خبرے'' (آسمانی باتیں) کے نام سے شامل ہیں۔ ہمدانی مرحوم کی یہ کتاب

اکتوبر 1957ء میں چھپی تھی۔ مولانا عبدالقادر کے مضامین کا مجموعہ "فکری یون" (فکری ارتقاء) کے نام سے 1964ء میں شائع ہوا ہے لیکن اس میں شامل مضامین دہلی سے شائع ہونے والے پشتو مجلے "نن پرون" (آج اور کل) میں بہت پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا عبدالقادر اس مجلے کے مدیر بھی تھے۔ اس مجموعے میں چند سنجیدہ مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ انشائیے بھی شامل کر دیے گئے ہیں جن میں ماشوم (معصوم)، میرنی رونہ (سوتیلے بھائی)، شعر، شاعری او شاعران (شعر، شاعری اور شعراء)، ھم په دغه (اسی طرح)، وتہ دی چی تہ دغیرہ داخل (خوش آمدید)، استوگنہ (رہائش)، خبری اتری (بات چیت)، او دا ھر چو (کس کا سب کا) وغیرہ شامل ہیں لیکن مولانا عبدالقادر کے جن انشائیوں کو شہرت ملی ہے وہ "ڈنگوریا" (پروپیگنڈہ چی) اور دا ازادی بربادی (آزادی کی بربادی) ہے۔ امیر حمزہ شنواری اور دوست محمد کامل کو شامل کر کے اس دور کے انشائیہ نگاری کی بابت ایوب صابر نے لکھا ہے:

"اسی طرح امیر حمزہ شنواری کے دو انشائیے "اگر میں وزیر ہوتا" اور "نسوار" بھی کافی مشہور اور دلچسپ ہیں۔ "اگر میں وزیر ہوتا" میں انہوں نے ایک محب وطن مفکر کا روپ دھارا ہے اور اپنے مجروح احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ حمزہ صاحب عالم و فاضل آدمی ہیں اپنی تحریروں میں ضرب الامثال کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں اور اس طرح ان کی تحریروں کا رنگ نکھر جاتا ہے۔

دوست محمد کامل نے جدید دور میں سب سے زیادہ انشائیے لکھے ہیں۔ آپ پہلے انشائیہ نگار ہیں جس نے شعوری طور پر انشائیے کے فنی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر انشائیے لکھے۔ حمزہ صاحب کی طرح آپ بھی اپنی تحریروں میں ضرب الامثال اور خالص پشتو کے الفاظ کو یوں استعمال کرتے ہیں جیسا ایک آقا اپنے غلاموں اور کنیزوں کو استعمال کرتا ہے۔ آپ کے انشائیوں میں "تیترہ" (تیمرا ایجنسی کے ایک پہاڑ کا نام) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اجمل خٹک نے اس انشائیے کو پشتو ادب کا بہترین انشائیہ قرار دیا ہے اس ضمن میں اجمل خٹک یوں رقمطراز ہیں:

"بعض نقاد مضمون کے ساتھ وقت اور فاصلوں کی جو قید لگاتے ہیں اس انشائیے میں ان کی حدود کی پوری نگہداشت کی گئی ہے۔ اس کے پڑھنے میں اتنا وقت لگتا ہے کہ ایک مصروف سے مصروف آدمی بھی اس سے محظوظ ہو سکتا ہے۔"

تیترہ کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں کامل صاحب نے نہایت شستہ اور مابین الشباکل زبان استعمال کی ہے۔

اس کے علاوہ "بھیک مانگنا بہت مشکل ہے" "کاکاجی ہمارے جلسوں میں" "یوسف کی یاد میں" "ایک عظیم بھولی قربانی اور رحمن بابا کے گنبد کی تعمیر بھی کامل صاحب کے بہترین انشائیے ہیں۔

دوست محمد کامل مرحوم کے انشائیوں میں کاکاجی صنوبر حسین کے بارے میں کئی انشائیہ نما مضامین شامل ہیں جن پر خاکوں کا گمان بھی ہوتا ہے لیکن مزاج اور ساخت کے لحاظ سے وہ انشائیے ہیں جیسے "کاکا جی د کباب په دوکان کښې" (کاکا کباب کی دکان میں) "کاکا جی په خپله حجره کښې" (کاکاجی اپنے حجرے میں) وغیرہ۔ اسی طرح حمزہ شنواری نے چند خوبصورت انشائیے لکھے ہیں جو ان کی کتاب "ژور فکرونه" (عمیق افکار) میں شامل ہیں۔ حمزہ شنواری کے دیگر انشائیوں میں "نن پرون" (آج کل)، "پښتو ادب"، "د ښځو خبرې" (عورتوں کی باتیں) شامل ہیں۔ اس دور کے اہم انشائیہ نگاروں میں ماسٹر عبدالکریم کا نام بھی شامل ہے۔ ماسٹر عبدالکریم کے افسانوی مجموعہ "جولئ گلونه" (جھولی بھر پھول) میں چند مضامین شگفتگی کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ "پاکه پانره" (پاک پتہ) اُن کے بہترین انشائیوں میں سے ایک ہے۔

افغانستان میں عبدالحئی حبیبی اور گل باچا الفت کے انشائیوں میں شگفتگی اور انشائیہ پن موجود ہے۔ عبدالحئی حبیبی کا انشائیہ "آزادی کوم ځائے ده" (آزادی کہاں ہے) اور گل باچا الفت کا انشائیہ "زما نظر" (میری نظر) زیادہ مشہور ہوئے تھے۔

پشتو کے سینئر انشائیہ نگاروں میں قلندر مومند، سید تقویم الحق کاکاخیل، لطیف وہمی، مراد شنواری، رشید علی دہقان، رب نواز مائل، بخش خلیل اور شفقت شہاب کے نام آتے ہیں جن کی انشائیہ نگاری پر ایوب صابر نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"قلندر مومند کا "چلہ شد"، مہدی شاہ کا "نکلسن پارک" اور راقم الحروف کا "انگڑائی" اور "دو الکاہت" وغیرہ جدید انشائیہ نگاری کے ایسے نمونے ہیں جن کی کھل کر تعریف کی گئی ہے۔

سید تقویم الحق کے انشائیوں پر طنز کی چھاپ گہری ہے۔ ان کے دو انشائیے "پڑاؤ" اور "لگ غوندے" (تھوڑا سا) مختلف رسائل میں چھپ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر چکے ہیں۔ ان کے اسی انداز سے متاثر ہو کر ارباب رشید احمد ریڈیو پشاور کیلئے ان کی خدمات وقتاً فوقتاً حاصل کرتے رہے ہیں۔ محمد لطیف وہمی کا "بن بلایا مہمان" بھی پشتو کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور بلیغ انشائیہ ہے اور ریڈیو پشاور سے نشر ہو کر سامعین سے خراج وصول کر چکا ہے۔

سلیم راز نے متعدد انشائیے لکھے مگر وقت اور فاصلے کی قید کو کبھی مدنظر نہیں رکھا۔ ان کے اکثر انشائیے بے حد طویل ہیں مگر تاثر سے خالی نہیں ہیں۔

مراد خان شنواری، رشید علی دہقان، رب نواز مائل، بخش خلیل اور شفقت شباب کے کئی انشائیے راقم الحروف کی نظر سے گزرے تو ہیں مگر ان کے خدوخال اب ذہن میں محفوظ نہیں ہیں۔ لہٰذا راقم الحروف ان پر رائے زنی کرنے سے قاصر ہے(٦٦)۔

اس دور میں اجمل خٹک نے چند انشائیہ نما مضامین لکھے جو ہفت روزہ رہبر میں خصوصی طور پر اور چند دیگر جرائد میں بھی شائع ہوئے۔ ان میں خوا گرزا احد یادونہ (تلخ و شیریں یادیں)، کلے کلولی (رکھ رکھاؤ)، درز ورونے (سنہری پودا)، دا کبر با چا لناں (اکبر بادشاہ کے زمانے میں کابل لوگ) اور حلال کڑے چرگ یم خو گوتی مه راوړه (ذبح کیا گیا مرغ ہوں مگر ہاتھ نہ لگاؤ) وغیرہ شامل ہیں۔

سید تقویم الحق کاکا خیل نے ''دیلاتی روزنامچہ'' (سیاح کا روزنامچہ) اور عبداللہ جان معلوم نے خوا گرزا احد (تلخ و شیریں) کے نام سے ریڈیو کیلئے جو سلسلے وار مضامین اور فکاہیہ طرز کے کالم لکھے ہیں ان میں سے کئی ایک پر انشائیہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے اخباری کالم نگاروں جیسے سعد اللہ جان برق، نور البشر نوید، سلیم راز اور چند دیگر نے جو کالم لکھے ہیں ان میں سے کافی کالموں پر انشائیہ کی چھاپ نظر آتی ہے لیکن ان لکھنے والوں نے اپنی تحریریں انشائیہ کے نام سے پیش نہیں کی ہیں۔

ان تحریروں میں اکثر و بیشتر ریڈیو کے لئے لکھی گئی ہیں مگر ان ریڈیائی تحریروں میں بھی عمومی طور پر سید تقویم الحق کاکا خیل کی تحریریں انشائیہ کے بہت قریب ہیں۔ مذکورہ لکھاریوں کے ساتھ سید تقویم الحق کاکا خیل کی تحریروں کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب سید تقویم الحق کاکا خیل: شخصیت اور فن میں یوں لکھا ہے:

''اس دور میں ریڈیو کے لئے چند دیگر نامی گرامی ادیب بھی اسی طرز کے پروگراموں کے لئے لکھا کرتے تھے۔ یہ پروگرام پشتونوں کے عوامی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان پروگراموں کی نوعیت، انداز اور ان میں طنز و مزاح کے عنصر کو میں نے اپنی کتاب پشتو زبان و ادب کی تاریخ میں اجاگر کیا تھا اور ساتھ یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ میاں صاحب کے لکھے ہوئے مسودات میں سے ''دیلاتی روزنامچہ'' (سیاح کا روزنامچہ) سمیت اس مزاج کے دیگر پروگرام کے بارے میں، میں

نے یوں لکھا تھا:

"اس دور میں پشتو نثر میں طنز و مزاح کے بہترین نمونے مختلف رسائل و اخبارات میں لکھے گئے جو نشاہیہ کالموں میں ملتے ہیں جن پر کالم نگاری کے ذیل میں تبصرہ کیا جائے گا۔ اسی طرح ریڈیو پاکستان پشاور کے لئے سید تقویم الحق کاکا خیل "وسیلائی روزنامچہ" (سیاح کا روزنامچہ) کے عنوان سے عبداللہ جان "مغموم" "خواگہ ترا خہ" (تلخ و شیرین) کے عنوان سے اور پھر "نی تازہ" (نئی تازی) کے عنوان سے اور ہمایوں ہما "خورے" کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

وسیلائی روزنامچہ کا مکمل مسودہ تقویم الحق کاکا خیل کے فرزند احسن تقویم نے مجھے عنایت فرمایا ہے۔ عبداللہ جان مغموم کی تحریریں "خواگہ ترا خہ" پہلے دو الگ الگ جلدوں میں اور 2006ء میں دونوں جلدیں ایک ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ "وسیلائی روزنامچہ" (سیاح کا روزنامچہ) کا انداز یہ تھا کہ سیاح کبھی کباب کی دوکان پر جاتا ہے تو وہاں کباب کے معیار، نرخ اور خرید و فروخت کے حوالے سے طنزیہ رنگ نمایاں کرتا ہے۔ کبھی واپڈا کے دفتر میں جاتا ہے اس طرح مختلف معاشرتی پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

ایک عنوان پر سمندر خان سمندر کے روزانہ باقاعدہ مکالمے نشر کیے جاتے تھے جن کے صدا کار قاضی صاحب اور ہدایت اللہ تھے۔ عنوان تھا "حجرہ" تھا عبداللہ جان مغموم کے "خواگہ ترا خہ" (تلخ و شیرین) ریڈیو کے پروگرام "حجرہ" میں پائندہ خان اور توکل خان کے مکالمے کی شکل میں معاشرتی مسائل پر نشتر زنی کرتے ہیں ۔ چند عنوانات اس طرح ہیں حجرہ، زیرانے، پائلہ، روژہ دار، انگور، نوموت، شیان، نان پائی، چرسیان، قرض دار وغیرہ (۹۷)۔

اگرچہ مذکورہ تحریریں طنز و مزاح کی نیت سے ریڈیو کے پروگراموں کے لئے لکھی گئی ہیں مگر ان تحریروں میں انشائیہ کے اسلوب کے رخ و خال واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان نثری شگفتہ تحریروں کو ہم انشائیہ کی ذیل میں زیر بحث لاتے ہیں ان کے علاوہ پشتو میں باقاعدہ انشائیہ نگاری کو ڈاکٹر اسرار نے تقویت دی ہے اور اپنے منفرد اسلوب نگارش کے نمونے پیش کر دیے ہیں۔

ہمارے جدید دور کے انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر اسرار اور مشتاق مجروح یوسفزئی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ مشتاق مجروح کے انشائیوں کا مجموعہ "یارانہ پہ شتالو" (یارانہ شفتالو پر) 1980ء میں شائع ہوا ہے، جس میں منفرد اسلوب بیان اور اہم موضوعات پر لکھے گئے انشائیے شامل ہیں۔ لیکن مشتاق

مجروح کے دو انشائیے زیادہ خوبصورت اور معیاری ہیں جو انشائیوں کے مجموعہ شائع ہونے کے بعد لکھے گئے ہیں اور "رسا چوغتائی مرکز" کے اجلاسوں میں تنقید کے لئے پیش کیے گئے ہیں۔ مرکز کے اجلاسوں کی کارروائیوں کی روداد ان انشائیوں کی اہمیت اور معیار کی گواہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسرار کا نام اور انشائیہ لازم و ملزوم ہیں۔ انشائیہ کا صحیح تعارف پشتو ادب میں ڈاکٹر اسرار ہی نے کیا ہے اور انشائیہ کے مزاج کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیا ہے۔ اگر ہم اردو کے انشائیہ نگاروں، جیسے ڈاکٹر وزیر آغا، مشکور حسین یاد، ابن انشاء، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان اور یونس بٹ کا اسلوب مدنظر رکھیں تو ہمارے ہاں صرف ڈاکٹر اسرار ان کی برابری کر سکتے ہیں۔ انہوں نے پشتو میں اس طرز کی نثر اور معیاری انشائیہ نگاری کے وجود کو ممکن بنا دیا۔ "دژوند پہ تکل کښی" (انشائیہ کی تلاش میں) ڈاکٹر صاحب کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جو 1994ء میں شائع ہوا اس میں کل سترہ (17) انشائیے شامل ہیں۔ ان انشائیوں میں "دژوند پہ تکل کښی" (انشائیہ کی تلاش میں)، "زما ڈائری" (میری ڈائری)، "سریزہ نگاری" "غزل نگاری، گوگم مشکل وگرنہ گویم مشکل، 1/4 قرض، تنقید، اجزائے لفظی اور ٹوخے (کھانسی) بہت مقبول ہوئے ہیں۔

اس مجموعے کے بعد لکھے گئے انشائیوں میں "تیز تکل" اور "مجنون پہ نوم خط" (مجنون کے نام خط) ڈاکٹر صاحب کے مقبول انشائیوں میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پشتو انشائیے کو جو معیار اور اسلوب عطا کیا ہے کوئی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا کیونکہ ان کے انشائیوں میں زبان کی شائستگی، جملوں کی برجستگی اور برمحل استعمال، مزاح کا لطیف رنگ اور طنز کے نشتر اس مہارت سے چلتے ہیں کہ طنز سے متاثرہ اور متعلقہ اشخاص کو بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ ڈاکٹر صاحب کی دلچسپ طرز تحریر کو مزے لے لے کر پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اس دلچسپ طرز تحریر کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کے انشائیوں میں مطالعہ کی جو وسعت اور مشاہدے کی جو گہرائی موجود ہے وہ پشتو کے کسی انشائیہ نگار میں نظر نہیں آتی۔

انشائیوں کا تیسرا مجموعہ قمر صحرائی کا ہے۔ "دژوند پہ آدینہ کښی" (انشائیہ کے آئینے میں) کے نام سے بیس انشائیوں پر مشتمل یہ مجموعہ 2000ء میں چھپا ہے۔ اس میں شامل زیادہ انشائیے جانوروں اور پرندوں کے ناموں پر لکھے گئے ہیں جیسے سپے (کتا)، خر (گدھا)، مچیں (چیل)، چتے (چڑی)، چرگہ (مرغی)، شادو (بندر)، نرلوٹ (یار)، پیشو (بلی) اور کچھ حشرات الارض جیسے لڑم (بچھو)، ویہ (دیمک) وغیرہ۔ کچھ انشائیے سماجی اور ثقافتی اقدار پر لکھے گئے ہیں جیسے حجرہ۔

قمر صحرائی کے انشائیے انتہائی مختصر مگر جامع ہیں۔ انداز دلچسپ اور موضوعات کے چناؤ میں مقصدیت کا خیال رکھا گیا ہے۔ انشائیہ کے لطیف پیرائے میں معاشرتی مسائل کی ترجمانی اور سماجی ناہمواریوں پر کڑی تنقید کی ہے۔

2000ء میں محمد اشرف غمگین کی کتاب "ننګو خالقائی" (انشائیے اور افسانے) شائع ہوئی ہے جس میں چودہ انشائیے اور باقی افسانے شامل کر دیے گئے ہیں۔ انشائیوں اور افسانوں کے علاوہ چند فیچر بھی شامل کتاب ہیں۔ اس کتاب میں کور (گھر)، گوتی (انگلیاں)، سینہ (سینہ)، عجیبہ (عجیب)، ژبہ (زبان)، مخ (چہرہ)، غوګ (کان) وغیرہ کے نام سے انشائیے شامل کر دیے گئے ہیں۔ اشرف غمگین کے انشائیے زبان و بیان کے لحاظ سے دلچسپ ہیں مگر انہوں نے مقصدیت سے زیادہ طنز و مزاح اور شگفتگی طبع کا خیال رکھا ہے۔

اب تک میرے معلومات کے مطابق پشتو میں خالص انشائیوں کے تین مجموعے مشتاق مجروح، ڈاکٹر اسرار اور قمر صحرائی کے شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ مضامین، کالموں اور افسانوں کے مجموعوں میں انشائیے شامل کر دیے گئے ہیں یا ان مجموعوں میں شامل تحریروں پر انشائیوں کی چھاپ نظر آتی ہے۔ خصوصی طور پر سید تقویم الحق کاکاخیل کی ریڈیائی تحریروں، دیہاتی روزنامچہ" عبداللہ جان مغموم کی ریڈیائی تحریروں، "خوګہ ترخہ" نور البشر نوید کے کالموں کی کتاب "ما ته غوږ شه" (مجھے سنو) وغیرہ میں کافی حد تک انشائیے کا رنگ جھلکتا ہے۔

ان انشائیہ نگاروں میں سعداللہ جان برق، سلیم راز، رب نواز مائل، داور خان داؤد، حمداللہ جان بسمل، حسین امیر فرہاد، محب اللہ شوق، جمیل یوسفزئے، ارشد اقبال وحید، ماشام خٹک، پریشان داوڑ ئے، قیصر آفریدی، فاروق فراق، خلیل باور، یاسین یوسفزئی، گل محمد بیتاب اور سید وحید گل کے نام نمایاں طور پر ہمارے سامنے ہیں۔

مذکورہ نئے انشائیہ نگاروں میں طیب اللہ خان نے اپنے انشائیوں کا مجموعہ "ار غے بر غے" حال ہی میں شائع کیا ہے اور انشائیہ کے میدان میں تسلسل کے ساتھ اضافہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح سینئر انشائیہ نگار حمداللہ جان بسمل کا مجموعہ "آن دی ریکارڈ" بھی اُن کے انشائیوں کے لکھنے کے بہت عرصہ بعد حال ہی میں منصۂ شہود پر آیا۔

مذکورہ دونوں انشائیہ نگاروں کا خصوصی طور پر ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ نوجوان انشائیہ

نگاروں میں طیب اللہ خان اور مبشر انشائیہ نگاروں میں محمد اللہ جان مُغل وہ لکھاری ہیں جن کا اسلوب بھی بہت دلکش اور انشائیوں میں گہرائی بھی کمال ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پشتو میں انشائیہ نگاری کے جس سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا وہ آج بھی جاری وساری ہے اور کئی نوجوان لکھاری اس صنف میں خاطر خواہ اضافے کر رہے ہیں۔

☆☆☆

خاکہ نگاری

پشتو میں خاکہ نگاری کی ابتداء ہی قیام پاکستان کے بعد ہوئی ہے۔ اگرچہ ہمارے کچھ محققین خاکہ نگاری کے اولین نقوش پشتو کلاسیکی شعراء خوشحال خان خٹک، رحمان بابا اور چند دیگر کی شاعری میں ڈھونڈتے ہیں یہاں تک کہ ان سے بھی پہلے روشانیہ تحریک سے وابستہ ادیبوں کی تحریروں میں خاکہ نگاری کے اثرات کا سراغ لگاتے رہتے ہیں مگر یہ واضح ہے کہ پشتو میں باقاعدہ خاکہ نگاری کا آغاز 1949ء میں ہوا۔ عبدالحلیم اثر افغانی اور کاکاجی صنوبر حسین دو ایسے لکھاری ہیں جنہوں نے باقاعدہ خاکے لکھے ہیں۔

ہمارے دوست نوجوان ادیب ایاز اللہ ترکزئی نے حال ہی میں "پشتو ادب میں خاکہ نگاری" کے موضوع پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ شائع کیا ہے جس میں اس صنف کے بارے میں کئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا گیا ہے اور ساتھ ہی پشتو میں خاکہ نگاری کے ابتداء وارتقاء پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس سے پیشتر ایوب صابر اور چند دیگر لکھاریوں کی تحریریں بھی موجود تھیں جو ایاز اللہ ترکزئی کے زیر مطالعہ تھیں۔

خاکہ اصل میں ایک جدید نثری صنف ہے۔ جس کے کچھ فنی تقاضے ہیں ان تقاضوں کو مدنظر رکھ کر پشتو میں خاکہ نگاری کی ابتداء اور ارتقاء کے بارے میں لکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں قاضی عبدالحلیم اثر کا لکھا ہوا خاکہ "خلیق صاحب" پشتو کا پہلا خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے جو پہلی بار جون 1949ء میں ہفت روزہ انصاف میں چھپا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ خاکہ فنی لوازمات پر پورا ہے لیکن اس کو پشتو کا پہلا خاکہ تسلیم کرنے میں پھر بھی تامل ہو سکتا ہے کیونکہ ستمبر 1952ء کے ماہوار اسلم میں کاکاجی صنوبر حسین کا لکھا ہوا خاکہ "زوڑ اشنا (پرانا یار)" چھپا ہے جو جنگ آزادی کے مجاہد پیر صاحب محمد ایوب شاہ کا خاکہ ہے۔ اس خاکہ میں کاکاجی صنوبر اپنے ایک دوست شاکر کی زبانی پیر صاحب کے خدوخال بیان کر رہے ہیں۔ اس خاکہ کے اندر شاکر کا بھی خاکہ کھینچا گیا ہے یوں یہ ایک خاکہ اصل میں دو شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ یہ خاکہ اگرچہ ستمبر 1952ء کے "اسلم" میں چھپا ہے لیکن خاکہ کے مندرجات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ 1949ء کی سردیوں میں لکھا گیا ہے۔(۱۸)

غرض دونوں خاکے 1949ء میں لکھے گئے ہیں اب یہ فیصلہ کون کرے کہ دونوں میں پہلا خاکہ

کون سا ہے۔ البتہ اتنی بات واضح ہے کہ عبدالحلیم اثر کا لکھا ہوا خاکہ پہلے شائع ہوا ہے۔ اس خاکہ پر ایک اور تنازع بھی ہے۔ اگرچہ ہفتہ وار انصاف اور دیگر موقعوں پر بھی یہ عبدالحلیم اثر کے نام سے شائع ہوا ہے لیکن عبد الحلیم اثر اور عبدالخالق خلیق جن کا خاکہ کھینچا گیا ہے کے ہمعصر محققین جیسے ہمیش خلیل، قلندر مومند وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ خاکہ عبدالخالق خلیق نے خود لکھا تھا۔ چونکہ عبدالحلیم اثر ہفتہ وار انصاف کے مدیر تھے لہٰذا انھوں نے پہلی مرتبہ یہ خاکہ خلیق صاحب کی اجازت سے اپنے نام سے شائع کیا۔ اس بات میں صداقت اس لئے بھی ہے کہ خلیق صاحب کے بیٹے عزیز الرحمن سے خلیق صاحب کی تحریروں کا جو ریکارڈ ہمیش خلیل نے وصول کیا ہے اس میں یہ خاکہ خلیق صاحب کے اپنے ہاتھ کی لکھائی سے ان ہی کی تحریروں میں شامل ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ایوب صابر مرحوم نے اپنی کتاب جدید پشتو ادب میں اس خاکے کے بارے میں اس وقت لکھا تھا جب عبد الحلیم اثر اور خلیق صاحب دونوں زندہ تھے کہ:

"عبدالخالق خلیق نے اپنے ایک خاکہ "خلیق" میں اپنی شخصیت اور خود کو جس شگفتہ اور طنز آمیز انداز میں پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے"(۲۱)

ایسی صورت حال میں بھی ہمارے محققین ان کے خاکہ کو نہ صرف پشتو کا پہلا باقاعدہ خاکہ کہتے چلے آئے ہیں بلکہ اس کو عبدالحلیم اثر کا لکھا ہوا خاکہ پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی کاکاجی صنوبر حسین کے لکھے ہوئے خاکے کو یکسر نظرانداز کرتے ہیں۔

ابتدائی دور کے چند خاکوں اور خاکہ نگاروں کا تذکرہ ایوب صابر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"پشتو کے خاکوں کا معیار اردو کے خاکوں سے کسی بھی اعتبار سے کم نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مقدار میں پشتو کے خاکے اردو کے خاکوں سے بہت کم ہیں اور اس میدان میں اردو میں تنہا محمد طفیل نے جو کام کیا ہے یہ پشتو کے تمام ادیبوں نے مل کر بھی نہ کیا ہوگا۔ مگر معیار میں پشتو کے خاکے اردو کے خاکوں سے کسی بھی مار نہیں کھاتے۔ اس میدان میں جن ادیبوں نے کام کیا ہے۔ ان میں میاں احمد شاہ بیرسٹر، عبدالخالق خلیق قلندر مومند، مراد خان شنواری، اصغر لالا، قمر راہی، رشید علی دہقان، تقی ہاشمی، رب نواز مائل، ایاز داؤدزئی، اسرار طوروی، عبداللہ جان مغموم، مشفق اور راقم الحروف وغیرہ شامل ہیں۔ البتہ ایسے ادیب صرف ایک ہی ہیں جن کے خاکوں کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں بھی چھپ چکا ہے اور وہ ادیب ہیں اصغر لالا۔

میاں احمد شاہ بیرسٹر کا خاکہ "عبدالغفور خان، ایاز داؤدزئی کے خاکہ "پشتون ابن بطوطہ (جس میں بلوچستان کے مشہور پشتون محقق سلطان محمد بابائی کے کیریکٹر کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں) اور "حمزہ" (جس میں با

قمر راہی مجلہ قند کی ادارت کے دوران مختلف ادیبوں کے بارے میں چند سطریں لکھا کرتے تھے
جن پر خاکے کا اطلاق ہو سکتا تھا مگر یہ خاکے انتہائی مختصر یعنی نامکمل ہوا کرتے تھے۔ راہی صاحب نے کئی شعراء
ادباء کے بارے میں سطریں لکھی ہیں اور اب یہ سطریں "کرخے" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو گئی
ہیں۔ اس طرح لطیف وہمی، قلندر مومند، بخش خلیل، میر مہدی شاہ مہدی اور ولی محمد طوفان نے روزنامہ "
الفلاح" میں مختلف اوقات میں "قلمی خصرے لنڈلی کنڈلی" (قلمی چہرے جو دیکھے ہوئے ہیں)
کے عنوان سے خاکے لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی اتنے مختصر ہوتے تھے کہ قمر راہی کی "کرخے" (سطریں) سے
ملتے جلتے تھے۔ ان میں عبدالصمد خان اچکزئے، امیر حمزہ شنواری، دوست محمد کامل، حسین بخش کوثر، عبدالرحیم
مجذوب، صاحبزادہ فیض، ولی محمد طوفان، لطیف وہمی، محمود قلندر، عبدالخالق خلیق، سمندر خان سمندر، راحت
زاخیلی، نصر اللہ خان نصر اور باچا خان کے خاکے لکھے گئے تھے جو تقریباً سارے 1955ء کے دوران شائع
ہوئے ہیں۔ ان خاکہ نگاروں میں قلندر مومند نے مکمل خاکوں کے ساتھ ساتھ قمر راہی کی تقلید میں چند ادیبوں
کی (کرخے) سطریں بھی لکھی ہیں جو ماہنامہ "اسلم" اور ماہنامہ ارژنگ پشاور کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔

پشتو کے دیگر خاکوں میں ایوب صابر کا لکھا ہوا رب نواز مائل کا خاکہ "تیراحول" (تیراہی) اور
قلندر مومند کا خاکہ جیتی، ایاز داؤدزئی کا لکھا ہوا سلطان محمد پائی کا خاکہ (پشتون ابن بطوطہ) عبداللہ جان
معصوم کا لکھا ہوا سمندر زبا پہ نظر کلمی (سمندر میری نظر میں) اسرار طور کا لکھا ہوا اکبر مسکین کا خاکہ "د پشتو
جالینوس" (پشتو کا جالینوس)، پروفیسر افضل رضا کا لکھا ہوا ایوب صابر کا خاکہ "جانان" ڈاکٹر اسرار کا لکھا ہوا
عبدالرحیم مجذوب کا خاکہ "دا مجذوب دے" (یہ مجذوب ہے)، م ر شفیق کا لکھا ہوا عبدالکافی ادیب کا خاکہ "
ادیب۔ کافی۔ ادیب" زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔

مردان سے تعلق رکھنے والے دو خاکہ نگاروں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ عبدالواحد قلندر اور
اقبال کوثر۔ عبدالواحد قلندر کا اسلوب بہت دلکش ہے اور اقبال کوثر کے خاکوں میں بہت گہرائی طنز اور سیاسی شعور
کی بازگشت نمایاں ہے۔

ستمبر 1999ء میں نذیر حسرت کے خاکوں کا مجموعہ "نقشونہ" (نقوش) کے نام سے شائع ہوا
جس میں کل تیرہ خاکے شامل ہیں اور آخر میں "نقشونہ" (نقوش) کے عنوان سے آٹھ مختصر خاکے الگ بھی
دیے گئے ہیں۔

ان باقاعدہ خاکوں اور خاکہ نگاروں کے علاوہ شخصیات پر لکھے گئے کچھ مضامین میں خاکے کا رنگ

دھنگ نظر آتا ہے لیکن یہ مکمل خاکے نہیں ہیں کیونکہ خاکہ نہ تو شخصیت نگاری ہے نہ سوانح لیکن اس میں یہ دونوں چیزیں بھی موجود ہوتی ہیں اور کچھ اور تکنیکی لوازمات بھی۔ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی نے 1978ء میں اعتراف نمبر کے نام سے ماہنامہ "پشتو" کا ایک خصوصی شمارہ شائع کیا تھا جس میں کئی مضامین میں خاکہ کے اثرات بھی نظر آتے تھے مگر فنی لحاظ سے یہ خاکے نہیں ہیں۔ اسی طرح عبداللہ جان مغموم کی ریڈیائی تحریروں "خواگہ تراخہ" (تلخ و شیریں) میں بھی خاکہ کے اثرات موجود ہیں۔ سلیم راز کی شخصیت پر کتاب "تنقیدی کرتے" (تنقیدی سطریں) اور ہمایوں ہما کی کتاب "خنکی خنکی خلق" (پیارے پیارے لوگ) میں بھی کہیں کہیں خاکہ کا رنگ جھلکتا ہے کچھ ناول نگار اور افسانہ نگاروں نے اپنے کرداروں کے خدوخال کو یوں واضح کیا ہے جس پر خاکوں کا گمان ہوتا ہے۔ جیسے اردو میں منٹو کے افسانوں میں ہوتا ہے مگر یہ بھی فکشن میں کردار نگاری ہے خاکہ نگاری نہیں۔

محقق افتخار محمد داؤد وفا نے اپنی کتاب "د پشتو معاصر تاریخ" میں جن خاکہ نگاروں کے نام گنوائے ہیں اس کی فہرست یہ ہے۔

ڈاکٹر اسرار، حبیب اللہ رفیع، ڈاکٹر چراغ حسین شاہ، سعید گوہر، سلیم راز، حیران خٹک، ڈاکٹر درویش، نورالبشر نوید، دوران یوسفزئی، محب وزیر، ہمایوں ہمدرد، حنیف خلیل، زاہد حسرت، صاحبزادہ رازق نور، مشتاق مجروح یوسفزئی، پروفیسر محمد ہمایوں ہما، محمد آصف صمیم، زرین نور، اجمل اینگی، نورولی سعید شنواری، قمر راہی، لطیف وہمی، قلندر مومند، بخش خلیل، میر مہدی شاہ مہدی، ولی محمد طوفان صابر، ایاز داؤدزئی، پروفیسر افضل رضا، عبدالواحد قلندر، اقبال کوثر، صاحبزادہ حمیداللہ، تاثین، صاحبزادہ قیصر، سلطان محمد صابر، رشید علی دہقان علی دہقان، سید خیر محمد عارف، ڈاکٹر محمد اعظم، عبدالخالق تسیم، عبدالکریم بریالی، مراد شنواری (۱۱۸)

ان باقاعدہ خاکہ نگاروں کے علاوہ چند ادیبوں نے کچھ ایسی بھی تحریریں کی ہیں جو شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کا ملا جلا عکس پیش کرتی ہیں۔ ایسے ادیبوں میں سب سے نمایاں نام سید محمد تقویم الحق کاکا خیل کا ہے جن کے خاکوں کا مختصر تذکرہ میں نے اپنی کتاب "سید تقویم الحق کاکا خیل: شخصیت اور فن" میں کیا ہے چونکہ تقویم الحق صاحب کے خاکوں پر شخصیت نگاری کے اثرات بھی نمایاں ہیں اس لیے ان کے خاکوں پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے خاکہ کے صنف پر بھی مختصر تبصرہ کیا ہے جو اس طرح ہے۔

"خاکہ" ادب کی ایسی صنف ہے جس میں کسی شخصیت کے اوصاف، ذاتی زندگی، علمی و ادبی

میلان اور دیگر شخصی اطوار و عادات کی جانب فنی انداز میں محض اشارے کیے جاتے ہیں اس میں تفصیلات نہیں ہوتیں۔ نہ ہی علمی لحاظ سے دقیق مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ محض چند ایسے اشارے ہوتے ہیں جن کی مدد سے کسی شخصیت کی ذات اور رجحان و میلان کا خاکہ تیار ہو سکے۔ اس کے علاوہ جب کسی شخصیت کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے علمی و ادبی کارناموں کی تفصیلات بھی علمی انداز میں پورے استدلال کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ متعلقہ شخصیت کی کسی بھی میدان میں پوری جدوجہد سامنے رکھ دی جاتی ہے تو گویا اس طرح متعلقہ شخصیت کی ابتداء سے لے کر آخر تک کی داستان تدریج و تسلسل کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ اس قسم کی تحریروں کو شخصیت نگاری اور سوانح کے ذیل میں رکھا جاتا ہے۔ میاں تقویم الحق کاکاخیل نے کچھ شخصیات کے بارے میں اس قسم کی تحریریں قلم بند کی ہیں جن میں خاکہ اور شخصیت نگاری یا سوانح کا ملا جلا تاثر ملتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی اس مزاج کی تحریروں کا تعارف ہم یوں کر سکتے ہیں۔

۱۔ حافظ صاحب، میرے دوست، مطبوعہ شفق (مجلہ)، مردان ۱۹۷۵ء

۲۔ مولانا عبدالقدوس قاسمی پشتو (مجلہ) اعتراف نمبر، دسمبر ۱۹۷۸ء

۳۔ قلندر مومند، قلندر مومند فن اور شخصیت، مرتبہ م شفق ۱۹۹۰ء۔

ان تینوں تحریروں کو ہمایوں ہما صاحب نے اپنی تالیف خورہ بکورہ میں محفوظ کیا ہے۔ مذکورہ تینوں تحریریں شخصیات کے بارے میں ہیں۔ ان تحریروں میں کہیں تو خاکہ کی صنف کا رنگ جھلکتا ہے۔ کہیں شخصیت نگاری اور کہیں خاکہ اور شخصیت دونوں کا ملا جلا عکس نظر آتا ہے۔ جب ہم ان تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازا ہوتا ہے کہ ”حافظ صاحب، میرا دوست“ کے زیر عنوان لکھی گئی تحریر میں مجموعی تاثر خاکے کی صنف کا جھلکتا ہے۔ اس خاکہ کا ابتدائی حصہ یوں ہے۔

”میری اور حافظ صاحب کی دوستی زیادہ عرصے کے لئے خدا کو منظور نہ تھی اور بہت جلد ختم ہوئی۔ اگر شب و روز کے میزان سے نہ تولا جائے تو ہماری دوستی بہت نمکین، بہت میٹھی اور بہت مشہور تھی دوستی دراصل خیالات، جذبات اور احساسات کو بانٹنے کا نام ہے اور ہم بہت کچھ آپس میں بانٹتے تھے۔ ہماری علم مشترک، دینی بھی اور دنیاوی بھی۔ ہمارے علم کے راستے مشترک، دونوں ہندوستان سے عربی و فارسی کے راستے انگریزی اور کالج کی طرف آئے تھے۔ ہمارا کالج ایک تھا۔ کالج کے کام اور اہل کاروں کے بارے میں ہماری رائے ایک تھی۔ ہمارا رشید بابا مشترک تھا۔ رشید بابا حافظ صاحب کو پسند تھے اور مجھے پسند آ گئے۔ اس مشترکہ محبت نے ہمیں ”یک جان دو قالب“ بنا دیا تھا“ (۷۲)

میاں صاحب کا یہ خاکہ پشتو کے نامور ادیب، عالم و فاضل حافظ محمد ادریس مرحوم کے بارے میں ہے جو ان کی وفات کے بعد قلم بند کیا گیا ہے۔ اس خاکہ میں میاں صاحب حافظ ادریس مرحوم کی شخصیت اوصاف اور علمی میلان کے بیان میں خاصے جذباتی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس خاکہ میں کئی مشاہدات اور نفسیاتی رجحانات بہت خوبصورت اور لطیف پیرایہ میں بیان کیے ہیں۔ اس بیان میں میاں صاحب ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ انہیں یہ بھی لکھنا پڑتا ہے کہ۔

"حافظ صاحب تذکرہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا اور میں نے اپنے لیے جو وقت مقرر کیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ ہاں ایک بات اور، حافظ صاحب دوستوں کو ان کی غلطیوں پر سمجھایا کرتے تھے۔ یہ ایسا کام ہے جواب کوئی نہیں کرتا۔ بہت سی باتیں جو اس دور میں مجھے ناگوار گزر رہی تھیں اب میری زندگی کا حصہ ہیں اور انھوں نے میری زندگی کی تعمیر کی ہے۔ ان کا سکھایا ہوا معیار اب میرے ذہن میں نقش ہے اور ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے" (۴۳)

شخصیات پر لکھی گئی تحریروں میں دوسری تحریر "مولانا عبدالقدوس قاسمی" کے عنوان سے ممتاز محقق و دانشور اور خیر البیان کے مقدمہ نگار حافظ عبدالقدوس قاسمی کی شخصیت کے متعلق ہے۔ اس تحریر کی ابتدا تو خاکہ نگاری کے اسلوب میں ہوتی ہے۔ میاں صاحب ابتدا ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

"سفید داڑھی، چھریرا جسم، مسکراتا ہوا چہرا، شگفتہ جبین، رعب کی ہے، جب ملتے ہیں تو آنکھوں سے محبت چھلکتی ہے اور جب کسی سے بات کرتے تو سوائے اس شخص کے باقی سب کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ علم کا رعب نہیں جماتے۔ علم کو بانٹتے ہیں۔ ایسا کون ہوگا جو علم دوسروں کو بخش سکے۔ مگر تھوڑا صبر کریں۔ میں نے شاید درمیان سے بات شروع کی (۴۴)

اس ابتدائیہ سے تو لگتا ہے کہ میاں تقویم صاحب حافظ عبدالقدوس قاسمی مرحوم کا خاکہ لکھ رہے ہیں مگر اس کے بعد وہ قاسمی صاحب کی سوانح لکھنا شروع کر دیتے ہیں پھر ان کی علمی و ادبی خدمات کی تفصیل تدریج و تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور پھر ان کی زندگی کی جدوجہد کی داستان سناتے ہیں۔ یہ انداز شخصیت نگاری کے ذیل میں آتا ہے اس لئے اس تحریر کو ہم خاکہ اور شخصیت نگاری کا ملا جلا عکس تصور کر سکتے ہیں۔

اس طرح کی تحریر "قلندر مومند" بھی ہے جس میں خاکہ اور شخصیت نگاری کا ملا جلا تاثر ملتا ہے۔ اس تحریر میں بھی میاں صاحب نے نامور نقاد و محقق قلندر مومند کے ساتھ اپنے تعلق کا پس منظر خاکے کی ہیئت

میں بیان کیا ہے اور پھر قلندر مومند کے علمی رجحان اور ان کی خدمات کا جائزہ لیا ہے اس تحریر میں میاں صاحب لکھتے ہیں۔

"قلندر مومند محبت کرنے والے شخص ہیں اور محبت کے قدر دان ہیں۔ ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے جس میں ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ ان سب کے ساتھ محبت کے مراسم روا رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے کام کے لئے رات کے وقت فارغ ہو جاتے ہیں۔ جس طرح محبت کرنے والے ہیں اسطرح ملول بھی بہت جلد ہو جاتے ہیں۔ ان کو منانا بھی بہت محنت طلب کام ہے۔ ان کے حلقہ احباب کی طرح ان کے مخالفین کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے۔ کوئی ایک بات پر ناراض کوئی دوسری بات پر۔ کوئی حق بجانب اور کوئی نہیں۔ اس کشمکش نے ان کی شخصیت کو زبردست رنگا رنگی بخش دی ہے۔ یوں ادب کی کوئی مجلس ان کے تذکرہ سے خالی نہیں ہوتی" (۵۵)

میاں تقویم الحق کاکاخیل کے اسلوب سے ملتے جلتے خاکے چند دیگر ادیبوں نے بھی لکھے ہیں مگر ان کے خاکے زیادہ تر شخصیت نگاری کے ضمن میں زیر بحث لائے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کا اسلوب نگارش ہمیں خصوصی طور پر سلیم راز، ہمایوں ہما اور چند دیگر کی تحریروں میں جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مذکورہ سینئر اہل قلم کے علاوہ کئی نوجوان اہل قلم بھی خاکہ نگاری کی صنف میں اضافے کر رہے ہیں۔ یوں یہ صنف اب پشتو کے نثری ادب کی محبوب و معروف صنف بن گئی ہے۔

☆☆☆

تحقیق

پشتو میں تحقیقی کام قیام پاکستان سے پہلے بھی ہوا ہے اور قیام پاکستان کے بعد بھی۔ پشتو میں تحقیقی کام منظم اداروں نے بھی کیا ہے اور نجی طور پر بھی محققین کی تحقیقی کاوشیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس تحقیقی کام میں نجی اور ذاتی طور پر حصہ لینے والے محققین کے علاوہ کچھ کام سرکاری اداروں نے کیا ہے اور کچھ غیر سرکاری اداروں اور ادبی تنظیموں نے سرانجام دیا ہے۔ اگر چہ پشتو میں تحقیق کے ابتدائی آثار کلاسیکی دور سے بھی ملتے ہیں مگر باقاعدہ تحقیقی کام کا آغاز مستشرقین نے کیا ہے۔ مستشرقین کے علاوہ افغانستان کے محققین نے بھی ابتدائی دور میں خاطر خواہ تحقیق کی ہے اور پرانے صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) کے ادیبوں نے بھی تحقیق کے میدان میں خاصی محنت کی ہے مگر ہمارا موضوع قیام پاکستان کے بعد پشتو میں تحقیقی خدمات کا جائزہ لینا ہے۔ اس لیے ہم براہ راست اسی دور میں تحقیقی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد تحقیقی خدمات کو بھی ہم کئی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مگر پہلے مجموعی طور پر تحقیقی کاوشوں کے بارے میں مختصر اظہار خیال کرتے ہیں۔

صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) میں پشتو اکیڈمی کا قیام ۱۹۵۵ء میں عمل میں لایا گیا۔ پشتو اکیڈمی تحقیق کے میدان میں اگر چہ وہ کام نہ کر سکی جس کی توقع کی جا سکتی تھی مگر پھر اکیڈمی کے ساتھ ساتھ اگر پشتو ڈیپارٹمنٹ پشاور یونیورسٹی اور ایریا سٹڈی سینٹر کی خدمات کو مدنظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ان اداروں نے پشتو تحقیق کے لئے جدید طرز پر کام کرنے کے لئے راستے کھولے ہیں۔ نامور محقق ڈاکٹر محمد زبیر حسرت نے مذکورہ اداروں کے تحقیقی کام کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

> پختونخوا میں تحقیقی کام دو پہلوؤں سے ہو رہا ہے ایک طرف سرکار نے پشتو اکیڈمی کا قیام عمل میں لا کر تحقیقی کاموں کیلئے راستہ ہموار کیا تو دوسری جانب بعض محققین نے کسی سرکاری سرپرستی کے بغیر انفرادی حیثیت سے بڑے مربوط اور منظم انداز میں تحقیقی کارنامے انجام دیے۔

اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے جن لوگوں نے قلم اٹھایا ان میں سید تقویم الحق کاکاخیل، عبدالحکیم اثر افغانی، ڈاکٹر خیال بخاری، پروفیسر پریشان خٹک، پروفیسر محمد نواز طائر، حاجی پردل خٹک، سید انوار

الحق کاکاخیل، پروفیسر محمد افضل رضا، ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک، حبیب اللہ رفیع، زلے ہیواد مل، ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک، ڈاکٹر سلمٰی شاہین، ڈاکٹر پرویز مہجور خویشکی، ڈاکٹر شاہجہان اور زرین انحور چوٹی کے محققین گردانے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر خیال بخاری بنیادی طور پر لسانیات کے ماہر تھے اور پشتو لسانیات کے باب میں انہوں نے بڑا پائے کا کام کیا۔ "د پشتو بنیادی مسئلے' غیر پوهنه" اور "پشتو صرف و نحو" ان کی مشہور تحقیق اور علمی تصنیفات ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف کلاسیکل شعرا کے ادوار کو بھی مرتب کیا اور ان پر جامع مقدمے اور حاشیے لکھے۔

پروفیسر پریشان خٹک نے پشتو لسانیات، ثقافت اور تاریخ کے موضوعات پر "پشتو لیک دود" "ورنہ پشتو" اور "پشتون کون؟" جیسی علمی اور تاریخی کتابیں لکھیں۔

پروفیسر محمد نواز طائر دراصل علم جغرافیہ کے میدان کے شہسوار تھے لیکن پشتون شاعر اور ادیب انہیں ایک فوک لورسٹ کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں۔ پشتو فوک لور میں انہوں نے "آدم خان درخانی: یوه خبره نه" "روهی متلونه" (دو جلدوں میں)، "د ماشو ماتو سندرے اور صوتونه" اور "لهه اور ژوند" جیسی تحقیقی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ پشتو ادب کی تاریخ کو "روہی ادب" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔

ان سبھی لکھنے والوں نے اکیڈمی سے باہر رہ کر بھی علمی، ادبی اور تحقیقی مشعل روشن کیں جو موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے پشتو زبان و ادب کا سرمایہ ہے۔

پشتو اکیڈمی کے پہلو بہ پہلو شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر جو کام کیا ہے ان میں ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک کا تحقیقی مقالہ "خوشحال بابا اور جمالیات" ڈاکٹر اختر خان کا "بریزید انصاری (پیر روخان)"، ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک "د پشتو ادبی تحریکونه" ڈاکٹر محمد اعظم اعظم کا "پشتو ادب کښی کردار نگاری" ڈاکٹر پرویز مہجور خویشکی کا "امرزائی خویشکی ل ہند، فن اور کلیات تدوین" "علی خیل دریاب بادشاہ دوم کا" "د خوشحال په کلام کښی مذکور شخصیات" صاحب شاہ صابر کا "پشتو ادب کښی تنقید" قاری محمد اسلام گوہر کا "پشتو ادب کښی نعت گوئی" ڈاکٹر عبدالواحید کا "پشتو ادب کښی د خدائی خدمتگارو برخه" ڈاکٹر حکیم اللہ جان کا "پشتو ادب کښی طنز و مزاح" احمد علی عاجز کا پشتو ادب کښی سفرنامہ" بی بی مریم کا پشتو ادب کښی ناول نگاری" عرفان خٹک کا "د پشتو غزل ارتقا" اور محمد زبیر حسرت کا قلندر مومند یو تنقیدی

مطالعہ" شامل ہیں۔

پشتو ادب کی تاریخ کے دو اہم مجلوں "پشتو" اور "قند" پر لکھے گئے تحقیقی مقالوں پر بھی پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی گئیں جو بالترتیب یاسمین پرویز اور ہمایوں ہما نے لکھے ہیں۔ یا محمد معصوم نے ایریا سٹڈی سنٹر سے The Rowshanties and Pashto Literature کے موضوع پر کام کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ پی ایچ ڈی کے مقالوں کے علاوہ ایم فل کی سطح پر بھی جامع مقالات سپرد قلم ہوئے جن میں بی بی مریم، شاہجہان، عبدالوحید خان، صاحب شاہ صابر، محمد جاوید خلیل، نجیم اللہ جان، محمد زبیر حسرت، نزاکت شاہین، مذکر شاہ خلیل، فضل ربی، عرفان خٹک، قاضی حنیف اللہ اور علی خیل دریاب کے مقالہ جات شامل ہیں۔

شعبہ پشتو سے ہٹ کر تعلیمی سطح پر جو تحقیقی کام ایریا سٹڈی سنٹر پشاور یونیورسٹی میں پشتو زبان و ادب اور تاریخ و ثقافت بارے انگریزی زبان میں ہوا وہ بھی نہایت حوصلہ افزا اور قابل قدر ہے۔ علاوہ ازیں اس ادارے نے بیخش خلیل کی مرتبہ ادبی کتابیں: اخلاق نامہ، فراق نامہ اور دیوان رحمت داوی اور میاں افتخار حسین کی "زخمی کلدے ووڑے" بھی طباعت کے مراحل سے گزاری ہیں۔(۷۱)

مذکورہ اداروں کی تحقیقی خدمات کے علاوہ نجی طور پر جن اشخاص نے پشتو تحقیق کے کئی گوشوں کو پرکھا ہے ان کا مختصر تذکرہ بھی محمد زبیر حسرت نے کیا ہے اور لکھا ہے۔

غیر سرکاری سطح پر جن محققین نے پشتو زبان، ادب و ثقافت اور تاریخ وفوک لور پر کام کیا ہے اس تفصیل کی اجمال کچھ یوں ہے:

دوست محمد خان کامل جو پشتو زبان، ادب اور تاریخ کے سائنٹفک محقق تھے، نے تاریخ، تحقیق اور تنقید کی دنیا میں جو پر مغز کام کیا ہے وہ اپنی طرز کی ایک نمائندہ مثال ہے۔ کامل صاحب کی تحقیقی کاوشوں میں "خوشحال خان خٹک" (اردو) "رحمان بابا" "تاریخ مرصع" "1630" ، "کلیات خوشحال خان خٹک" "دسکندر خان خٹک دیوان" "درحمان بابا کلیات" (قلندر مومند کے اشتراک عمل سے) بڑے پائے کی ادبی تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی کاوشیں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بہت سارے علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مقالے وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و رسائل اور کتابوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کاکا خیل نے اپنے حساوں اکیلی جان "پختانہ د تاریخ پہ رنڑا کښې" ظفر اللغات، شیخ رحمکار رحمانالیق پشتو اور پشتون اپنی نسل کے آئینے میں (اردو) جیسی تاریخی

لسانی، سوانحی اور ہدایت و رہنمائی کی بیش قیمت علمی و تحقیقی کتابیں خیابان ادب کے دامن میں ڈال دیں۔ ظفر صاحب کے بقول بالآخر در حقیقت ان راستوں کو منزلوں تک لے جانے کی روش ہے جن سے گزرتے ہوئے اور ارادوں کے باوجود اپنا کام ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔

قاضی عبدالحلیم اثر افغانی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ انہوں نے اپنی دنیا آپ پیدا کر کے تحقیق کے دھیمے سفر میں تیزی لاتے ہوئے اچنبے ہونے کا ایسا ثبوت پیش کیا، جو پختونخوا میں کسی اور سے نہ ہو سکا (تائید یا ترمیم کی صورت چلے تو اور بات ہے) لیکن اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ "پشتو ادب" رموز مجاہدین، روحانی تڑون اور روحانی رابطہ اور "تھیر شعر شاعران" کے علاوہ کم از کم بیس ایسی کتابیں ان کے کریڈٹ پر ہیں جو ابھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آنے کی منتظر ہیں (ان کے بعض قلمی نسخے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی میں محفوظ ہیں)۔

سید تقویم الحق کاکاخیل نے پشتو ادب میں تحقیق کے جو نئے در وا کیے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ اخوان درویزہ کے "مخزن" کی تدوین اور اس پر تحریر کیا ہوا جامع مقدمہ ہے، علاوہ ازیں علی خان کے دیوان کی ترتیب و تدوین کرتے ہوئے اس پر تحقیقی مقدمہ لکھا۔ کامگار خان خٹک کے دیوان کو ترتیب دیتے ہوئے نئے سرے سے اس پر مقدمہ، نوٹ اور حواشی لکھے۔ (اس سے قبل یہ دیوان سید انوار الحق کاکاخیل نے مرتب کیا)۔ ان تینوں کتابوں کی تشہیر و اشاعت کا سامان پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی نے کیا۔ تقویم صاحب کے دوسرے بہت سے علمی تنقیدی اور تحقیقی مقالے مختلف اخبارات و رسائل اور کتابوں میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں جن میں وحدت الوجود اور رحمان بابا" اور "حمزہ غزل" (حمزہ کی غزل) کی خصوصی طور پر یاد کیے جاتے ہیں۔

ہمیش خلیل کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی شاعری اور دواوین سے اندھیرے کا نقاب ہٹاتے ہوئے اسے اجالے کے اسٹیج پر لا بٹھایا۔ انہوں نے نہ صرف ان دواوین کو بڑے پیمانے پر تدوین و ترتیب کے عمل سے گزارا بلکہ ان پر بہت ہی واضح مقدمے بھی لکھے اور انہیں ادارہ دارالتصنیف سے شائع کرا کے ادبی حلقوں تک پہنچایا۔ یہ سلسلہ عبدالقادر خان خٹک، اشرف خان ہجری، سعید، حسین، کاظم خان شیدا، قمر علی خان اور کزئی، رحمت داوی اور فدا، عبدالمالک کے دواوین کی ترتیب و تہذیب، فضل احمد غوری کی کتاب "دغره گلونه" اور دوست محمد خان کامل کے پشتو اور فارسی شعری مجموعوں "دلفکر و نو ڈیوے" اور "گلدستۂ یثرب" سے آگے تک پھیلا ہوا ملتا ہے۔ علاوہ ازیں "ورکہ خزانہ (دو

جلدوں میں) "پختانہ لیکوال" اور "د قلم خاوندان" جیسے تذکرے ان کی قابل ستائش یادگاریں ہیں۔ قلندر مومند نے "پٹہ خزانہ فی المیزان" کے جواب میں دو حصوں پر مشتمل تحقیقی کتاب "قول پارسنگ" اور سعید گوہر کی کتاب "پٹہ خزانہ فی الحقیقت کے جواب میں" "حقیقت داد" بھی ان کی لائق توجہ تحقیقی اور تنقیدی کاوش ہے۔ ہمیش خلیل کا تحقیقی کام خاصی وسعت رکھتا ہے، ان تحقیقی کتب کے علاوہ ان کے مقالے ملک کے اخبارات اور مجلوں کو زینت بخشتے ہوئے ہیں۔

قلندر مومند پشتو کے علمی، تنقیدی اور تحقیقی میدان کے ان سربرآوردہ قلمکاروں میں سے ہیں، جن کی تحقیق کا علمی معیار مسلمہ، مجموعی بہت مستند حیثیت کا حامل ہے۔ ضربت قلندری نے پشتو تحقیق کے جمود میں برسوں سے لگے لگائے روایتی بتوں کو توڑ کر سلسلہ افکار میں انقلاب برپا کیا۔ "خیرالبیان کا تنقیدی مطالعہ" اور "پٹہ خزانہ فی المیزان" "دابوالقاسم دیوان" "د رحمن بابا کلیات" (مال کے ساجھے داری میں) "تنقید" اور "لغویات" "نظر نظر ادائے کمال و جمال کے نمونے ہیں۔ "پشتو کی تاریخ میں" دریاب" (فرید صحرائی کے اشتراک سے) ان کا ایسا علمی اور لسانی کارنامہ ہے جس کی ہمسری شاید مدتوں کوئی نہ کر سکے۔

روشن خان، جو بنیادی طور پر ایک قانون دان تھے، نے پشتونوں کے نسلی مباحث سے متعلق "تذکرہ یوسف زئی قوم کی سرگزشت" اور "پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ" نامی کتابیں لکھیں اور اس طرح اردو دنیا کو پشتونوں کے قبیلوں سے آشنا کیا۔

داور خان داؤد نے "د رحمان بابا ژوند او تعلیمات"، "پشتو ټپه"، "پشتو ادب کښې متل" اور پشتو فولکلور کښې الا" جیسی پائے کی کتابیں لکھیں۔

ڈاکٹر محمد اعظم اعظم نے پشتو افسانہ، تحقیق اور تنقید اور پشتو ادب کښې کردار نگاری جیسی مستند تحقیقی کتابیں اور متعدد مقالے لکھے جو حسب موقع مختلف اخباروں میں چھپتے رہے ہیں۔ پروفیسر افضل رضا نے "د پشتو نثر تاریخ" "ڈرامہ فن او تنقید" "تحقیق او تنقید" "د پشتو غزل او" "پټ ستوری" جیسی تاریخ اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ علاوہ ازیں بہت ساری چھوٹی بڑی کتابیں اور کثیر تعداد میں ان کے لکھے گئے مقالے پشتو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ پروفیسر محمد ہمایوں ہما نے اردو میں تحقیق کے فن اور تحقیق کے بنیادی اصولوں پر بعض مقالے ٹرم پیپرز کے طور پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کے

دوران لکھے، جو "تحقیق فن" (تحقیق کا فن) کے نام سے محمد زبیر حسرت نے پشتو میں ترجمہ کیے۔

زیر بحث نمو میں مذکورہ بالا قلمکاروں کے علاوہ میر عبدالصمد خان، میاں سید رسول رسا، (خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے دواوین پر رسا کے لکھے گئے مقدمے اہم تحقیقی کارنامے ہیں) ، سید تسنیم الحق کاکاخیل، عقاب خٹک، خواجہ محمد سائل، پروفیسر نصیر الدین نصیر، فریاد محمد غالب ترین، رحیم شاہ رحیم، سید محمد انظر، صاحب شاہ صابر، میاں وکیل شاہ، قلندر خیل، مشتاق مجروح یوسف زئی، فیض الوہاب فیض، عبداللہ جان عابد، حنیف خلیل، دراب ہمدرد اور زبیر حسرت نے مختلف موضوعات پر کتابیں اور تحقیقی مقالے لکھے جو کتابی صورت میں یا مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے (۷۷)

اگر ہم پشتو میں تحقیقی رجحان کا قیام پاکستان کے بعد جائزہ لیں گے تو سب سے پہلے مختصر اظہار خیال ان تذکروں کے بارے میں کرنا پڑے گا جو باقاعدہ تحقیق کے اولین نقوش سامنے لاتے ہیں۔ تذکروں میں اگرچہ مختلف شخصیات کے کلام کا کچھ حصہ بھی شامل ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ شخصیات کے بارے میں تحقیقی مواد بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ پشتو میں اگرچہ تذکرہ نگاری کی روایت بہت پرانی ہے مگر ہم قیام پاکستان کے بعد شائع شدہ مشہور و معروف تذکروں کا تذکرہ کرتے ہیں جو تحقیقی مواد بھی رکھتے ہیں۔ مذکورہ تذکروں کی تفصیل یوں ہے۔

ذخیرادب (خیبر کا ادب)

مراد شنواری کا مرتب کردہ تذکرہ ہے جس میں ان شعراء و ادباء کا ذکر ہے جو درہ خیبر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تذکرہ میں کلاسیکی دور سے لے کر معاصر شعراء حال اور ان کا نمونہ کلام دیا گیا ہے۔ روشنیہ تحریک کے شعراء چونکہ درہ خیبر میں رہائش پذیر تھے اس لئے ان کا ذکر بھی اس تذکرہ میں موجود ہے۔ اس تذکرہ میں پہلا شاعر مرزا خان انصاری ہے اور کل 38 شعراء کا حال اور نمونہ کلام دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ مراد شنواری کا بڑا کارنامہ اس لیے ہے کہ اس دور میں جدید تذکرہ نگاری نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ یہ تذکرہ 1958ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

پښتانه ليکوال (پشتون لکھاری)

یہ بخش خلیل کا تذکرہ ہے جو پہلی بار 1958ء میں دارالتصنیف پشاور نے شائع کیا۔ اس

تذکرہ میں بیسویں صدی کے جدید شعراء کے حالات اور کلام کے نمونے دیے گئے ہیں۔ پہلی اشاعت میں شعراء کی تعداد زیادہ تھی اور حالات اور کلام پر تبصرہ بہت مختصر دیا گیا تھا۔ دارالتصنیف پشاور کے اہتمام سے جب اس تذکرہ کی دوسری اشاعت 1961ء میں آئی تو شعراء کی تعداد کم کر کے ان کے کلام پر تبصرے اور تنقیدی آراء دی گئیں۔ جدید دور میں یہ ایسا تذکرہ ہے جو تذکرہ نگار کے تنقیدی شعور اور تجزیہ و تبصرہ کی صلاحیت پر بھی دال ہے۔ اول الذکر اشاعتیں الگ الگ ایڈیشن پر چھپی ہیں جبکہ دوسرے ایڈیشن کی ایک اور اشاعت ادبی مرکز سرائے نورنگ بنوں کے اہتمام سے بھی 1993ء میں آئی ہے۔

ورکہ خزانہ (گمشدہ خزانہ)

ورکہ خزانہ دو جلدوں پر مشتمل بخش خلیل کا ایک اور تذکرہ ہے جو قدیم شعراء کے منتخب کلام اور احوال پر مشتمل ہے۔ ورکہ خزانہ کی دونوں جلدیں 1960ء میں شائع ہوئی ہیں۔ پہلی جلد میں چودہ شعراء کے کلام کے نمونے مسلسل دیے گئے ہیں اور بعد میں شعراء کے حالات آئے ہیں جبکہ دوسری جلد میں شاعر کے حالات پھر کلام کا نمونہ دیا گیا ہے۔ اس تذکرہ میں بخش خلیل نے کئی ایسے شعراء کا تعارف اور نمونہ کلام کی دریافت کے بعد چند شعراء کے دواوین بھی متعارف کروائے ہیں۔ اسی لیے تو دوسری جلد کے مقدمہ میں مولانا عبدالقادر نے کہا ہے کہ پشتو ادب میں ابھی "پٹہ خزانہ" کی دریافت کی صدائیں گونج رہی تھی کہ بخش خلیل نے ورکہ خزانہ (گمشدہ خزانہ) دریافت کیا۔

اوسنی لیکوال (ہم عصر لکھاری)

یہ تذکرہ افغانستان کے نامور محقق اور دانشور عبدالرؤف بے نوا نے تین جلدوں میں مرتب کیا ہے جو وزارت اطلاعات و ثقافت کابل کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ اس تذکرہ میں بخش خلیل کے "پشانہ لیکوال" (پشتون لکھاری) سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔

تیر ہیر شاعران (بھولے بسرے شعراء)

نامور محقق عبدالحلیم اثر کا تذکرہ ہے جو پشتو کے قدیم شعراء کے احوال اور کلام پر مشتمل ہے۔ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے اہتمام سے 1963ء میں شائع ہوا ہے۔ اس تذکرہ میں کئی شعراء کے

احوال بخش خلیل کے د ورکہ ترانہ اور عبدالحئی حبیبی کے پٹانہ شعراء میں بھی آئے ہیں۔

پښتنې لیکوالې او شاعرانې (پشتون لکھاری اور شاعرات خواتین)

یہ تذکرہ کبری مظہری ہوتد نے مرتب کیا ہے جس میں افغانستان و پاکستان کی باون خواتین شاعرات اور لکھاریوں کے حالات اور تحریروں کے منظوم نمونے دیے گئے ہیں۔ تذکرہ کلاسیکی دور سے لے کر بیسویں صدی کی خواتین کا احاطہ کرتا ہے۔ میرمن نیک بختہ کا تعارف سب سے پہلے دیا گیا ہے جبکہ نفیسہ بی اس تذکرے کی آخری خاتون شاعرہ ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں بیس صفحات پر مشتمل کبری مظہری کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔ دو سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل یہ تذکرہ "افغانستان دعلومو اکاډمۍ" نے 1366ھ میں شائع کیا ہے۔ اس تذکرے کی پہلی جلد ہے لیکن دوسری اور باقی جلدیں ابھی تک سامنے نہ آسکیں۔

د پښتو غزل (پشتو غزل)

پروفیسر افضل رضا مرحوم کا مرتب کردہ تذکرہ ہے جو امیر کروڑ (پہلے غزل گو شاعر) سے لے کر بیسویں صدی کے شعراء تک غزل کے نمائندہ شعراء کا مختصر حال اور کلام کے نمونوں پر مشتمل ہے۔ تذکرہ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور کی غزل پر آخر میں مجموعی تبصرہ کیا گیا ہے۔ روشنیہ تحریک، خوشحال، رحمن اور عبدالحمید مہمند کے مکتب فکر کے شعراء پر الگ الگ تبصرے دیے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی نے 1978ء میں شائع کیا ہے۔

پټ ستوري (پوشیدہ ستارے)

افضل رضا کا ایک اور تذکرہ ہے جو پشتو کے سو قدیم شعراء کے کلام اور احوال پر مشتمل ہے یہ ضخیم تذکرہ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی نے 1984ء میں شائع کیا ہے۔

صدیق اللہ رشتین کے دو تذکرے "نومیالي شاعران" (نامور شعراء) اور "پیاوړي شاعران" (معتبر شعراء)، سیال کاکڑ کا "د کسي د لمنې پښتانه لیکوال" (کسی پہاڑ کے دامن میں آباد پشتون لکھاری)، حبیب اللہ رفیع کا ادبي ستوري (ادبی ستارے) زلمے ہیوادمل کا "بیدیاني گلونه" (صحرا کے پھول) محمد

اشرف کا "داشنغر ادب" (ہشت نگر کا ادب) اور اخونزادہ فرمان مسافر کا "حلقہ وستوری" (روشن ستارے) پشتو تذکرہ نگاری کے میدان میں قابل ذکر تذکرے ہیں۔ آخر میں تذکروں کی ایک فہرست مع سن پیش کی جاتی ہے جس میں اوپر مذکورہ کچھ تذکروں کے نام کی تکرار بھی ہوئی ہے۔

نمبر شمار	نام تذکرہ	سن	مرتب
1	دا حساس ستر گی	1985ء	عبدالباری اسیر
2	ادبی جهری	1984ء	پرویز مجبور
3	ادبی گل سته	1984ء	قاسم ہوتی
4	ادبی گلونه	1983ء	اشرف غمگین
5	داشنغر ادب	1979ء	قاسم ہوتی
6	داشنغر گلونه	1998ء	شہریار قاش خیل
7	اسیل	1972ء	محمد شفیق زلے
8	دتیر ادب	1971ء	مجیب ورانے
9	پښتانه لیکوال	1985ء	ہمیش خلیل
10	پښتو ادب په سویلی پښتونخوا کښی	1989ء	صاحبزادہ حمید اللہ
11	دپښتو حلقه ستوری	1984ء	اخونزادہ فرمان مسافر
12	پښتو کتونه	1991ء	میر احمد کامل / سیف الاسلام
13	پښتنی لیکوالی او شاعرانی ډومبے توک	1366ھ	کبری مظہری
14	پلونه او لاری	1993ء	رائل پشتو ادبی ٹولنہ پشتون گڑی نوشار
15	دی پوئیس آف مالاکنڈ	1949ء	شمس الرحمان شمس
16	دتوری او قلم خاوند	1958ء	محمد نواز خٹک
17	جواهر دتوبتار قدیم شعراء	....	امان اللہ احسان
18	دخیبر ادب	1958	مراد شینوارے
19	دخیبر لیکوال	1988ء	کلیم شینوارے
20	دچپل لمن	1998ء	قمر صحرائی

21	دلخوګ دے اول توک	1983ء	سرحد پښتو ادبي ټولنه
22	دلخوګ دے دویم توک	1986ء	سرحد پښتو ادبي ټولنه
23	د راحت ګلونه	1989ء	رفیق زاخیلی او حاجی ګل صوفی
24	روشی اګلے حاتے (اردو)	1991ء	عبدالباری اسیر
25	ستوری	1992ء	محمد اقبال حیران
26	د سدا نګارې	1995ء	شائستہ شال سہا
27	سویلي ستوری	1973ء	قلم بہادر اسد قریشی
28	د سنده فضا او پښتنو یادونه	1995ء	محمد اسلام نګار
29	سهيلي پښتو نخوا کې دفتر لیکوونکي	1978ء	کلیم اللہ صدام
30	د صحرا کاروان	1990ء	مہر بخش صدیقی
31	د صحرا ګلونه	1986ء	پښتو ادبي ټولنه دوحہ قطر
32	د ضلع نوښار تهر جهر شاعران	1993ء	سیف الاسلام سیف
33	طرتی به ګل شی	1990ء	بیتاب عادلوی
34	د قلم سفر اوله حصه	1989ء	عبدالرؤف نوشہروی
35	د کاروان ملګری	....	اقبال تنہا
36	د ګړه مار ګلونه	1989ء	ګړه مار پښتو ادبي جرګه اسماعیله
37	د کسی ګلان	1989ء	حافظ خان محمد
38	د کسی دلمنی پښتنانه لیکوال رومے توک	1974ء	سیال کاکړ
39	د کسی دلمني نه لیکوال دویم توک	1983ء	سیال کاکړ
40	لاروی	1997ء	کمل یار شرخیالی
41	مشکبنې به حو	1992ء	بیتاب عادلوی
42	نمر و تو ستوری	1996ء	تاج علی تاج الامانی
43	نمر و تو غزل زار	1998ء	ایوب ګل
44	ننند باز چیے	1997ء	قمر صحراوی

45	ننګیالی پښتانه	1997ء	عمرداز عمر مروت
46	وارېښي څوکي	1986ء	رحیم شاه رحیم
47	درګسو بېنیر	1998ء	ارین یوان
48	دهزاري کلونه	1988ء	اسمعیل گوہر
49	همیشه ژوند	1986ء	سید اکبر صابر
50	همیشه کلونه	1992ء	علی خیل دریاب
51	مهر اد نه تری	1996ء	عربستان پشتو ادبی تړون
52	دریکی سیمی ، ادبی تذکره	1999ء	جوهر خلیل
53	پهښوری ستوری	1999ء	عارف الله اظهر او نسیم خان نسیم
54	ادبی رودباره - اول جلد	1999ء	ریاض افریدے
55	خبرے په قلم دریم توك	2000ء	عمرداز مروت
56	لعلونه	1999ء	اختر ملک او رحیم سید خان
57	اور بلکی	1994ء	جناب غازلوی
58	کاروان	1984ء	اورنگزیب اورنگ
59	حرك	2000ء	اقرار الدین افریدے
60	مسکا نشو ندو په غزل خوریزی	2000ء	عمرداز مروت
61	پیښتانه ستوری	2001ء	جمال حسین اکبر
62	مومند ادبی ستوری	2000ء	عبد الصمد مومند
63	أبشارونه دبیلون	2000ء	جنرل ناصر او جان محمد وکیل
64	دکراچی کلونه	2002ء	الطاف گل گل
65	جکی شملی	2003ء	فیروز فریدے او امت شش
66	بناغلی	2003ء	جان ساقی
67	دستورو کاروان	2003ء	پشتو ادبی غورځنگ - ریاض سعودی عرب
68	تک	2003ء	محمد ایوب ایوب

69	د دراوی ادب	2004ء	شیر شاہ ترخوی
70	مرجونه	2004ء	ارشد جان شاہکار
71	لنډې پاڼې	2001ء	عمروراز مروت
72	غنچه	2003ء	محمد علی محب-علام حسین محب
73	حلاړ	2006ء	تصیر تجلی

تذکرہ نگاری کے بعد پشتو تحقیق میں اہم کام قدیم قلمی نسخوں کی ترتیب و تدوین اور دواوین کے ساتھ تحقیقی مقدموں کی صورت میں ہوا ہے۔ اگرچہ قلمی نسخوں اور دواوین کی ترتیب و تدوین کا یہ کام قیام پاکستان سے پہلے بھی ہوا ہے مگر زیادہ کام قیام پاکستان کے بعد ہی ہوا ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے اپنی کتاب مختصر تاریخ زبان وادب پشتو میں مختصر تذکرہ ۲۰۰۹ء میں کیا تھا، جس سے استفادہ کرتے ہوئے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

پشتو تحقیق کا ایک اہم پہلو دواوین اور قدیم نسخوں کی تہذیب، ترتیب و تدوین کا کام ہے۔ پشتو میں دواوین کی ترتیب و تدوین کا کام قدیم دور میں مصنفین نے خود کیا ہے۔ کئی شعراء نے اپنے دواوین کا ذکر بھی اس سلسلے میں کیا ہے۔ زمانی اور موضوعاتی لحاظ سے متفرق منظومات کو الفبائی ترتیب میں لکھنا، اس دور کا تحقیقی تقاضا تھا جو روخانیہ تحریک سے منسلک شعراء نے شروع کیا تھا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ خوشحال خان خٹک اور رحمن بابا نے اپنے دواوین خود مرتب کیے تھے۔ رحمن بابا نے اپنے دیوان کا ذکر بھی کیا ہے:

زه رحمن په خپل اشعار شکر گذار یم
چې دا طلسي رنگ دیوان مې دے مونډلے

ترجمہ

"میں رحمن اللہ کا شکر گزار ہوں کہ اس پاک ذات نے مجھے اتنا قیمتی دیوان عطا کیا ہے"۔

اس طرح کلاسیکی دور کے باقی شعراء نے بھی اپنے دواوین کو الفبائی ترتیب دی اور اصناف کی درجہ بندی خود کی ہے۔ کاظم خان شیدا پہلا شخص ہے جس نے اپنے دیوان کے ساتھ مقدمہ بھی لکھا ہے اور اپنے دیوان کا تعارف، سن ترتیب اور دیگر معلومات بھی دی ہیں۔

اس دور میں چمکنی کے میاں عمر کے صاحبزادے صاحبزادہ محمدی نے خصوصی طور پر دواوین

کی کتابت اور تحفظ کا اہتمام کیا تھا اور کئی قدیم شعراء کے دواوین کو کتابت کرنے کے ساتھ ساتھ کئی نسخے بنائے جاتے اور محفوظ کیے جاتے تھے۔

دواوین کی اس قدیم روایت کے بعد ترتیب و تہذیب کا جدید دور آتا ہے جس میں ابتداء میں کچھ دواوین مقدموں کے بغیر شائع ہوئے ہیں اور زیادہ مرتب و مدون کے تحقیقی مقدمات کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ مولانا عبد المجید افغانی جدید دور کے پہلے محقق ہیں جنہوں نے قدیم نسخوں اور متون کی تہذیب بھی کی ہے اور ساتھ مقدمے بھی تحریر کیے ہیں۔ انہوں نے 1929ء میں رحمن بابا کا دیوان اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ تحقیق کے نئے تقاضوں کے مطابق ترتیب دیا۔ افغانستان کے عبدالحئی حبیبی نے خوشحال خان خٹک کی کلیات ''د خوشحال ملغلرے'' (خوشحال کے موتی) کے نام سے اپنے علمی مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد خوشحال اور رحمن کے دواوین کوئی دفعہ مختلف مرتبین کے مقدمات، تحقیقی تعلیقات اور حواشی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوئے۔ ساتھ ساتھ نثری کتب کے قدیم نسخوں اور پرانے متون کی تدوین کا کام بھی ہوتا رہا۔ نثری کتب کے تدوین میں حافظ عبدالقدوس قاسمی کا خیر البیان، دوست محمد کامل کا تاریخ مرصع، سید تقویم الحق کاکا خیل کا مخزن الاسلام، پشتو تحقیق میں انتہائی مستند و معیاری کام ہے۔ دواوین کی ترتیب و تدوین میں عبدالحئی حبیبی کے بعد عبدالرؤف بے نوا کا دیوان کاظم خان شیدا، خیال بخاری کا دیوان معزی خان گلگیانی، دیوان نجیب اور پشتو اکیڈمی کے دیگر چند دواوین کی ترتیب و تدوین، تقویم الحق کاکا خیل کا دیوان علی خان، سید انوار الحق کا دیوان، عبدالحمید، سید تسنیم الحق کاکا خیل کا دیوان کاظم کارحمن خٹک، پشتو تحقیق میں اہم اضافے سمجھے جاتے ہیں۔ پشتو اکیڈمی نے چند دیگر دواوین جیسے عبدالقادر خان خٹک کا دیوان، دیوان شمس الفلک، دیوان خواجہ محمد بنگش، دیوان میاں نعیم وغیرہ کی ترتیب و تدوین کا کام بھی مختلف محققین سے کروایا ہے۔ نثری کتابوں میں حبیب اللہ فریح کا دبیر دانش جو شاد محمد خان کی مترجمہ کتاب ہے کی تہذیب و تدوین بڑا کارنامہ ہے۔ افغانستان کے محققین میں عبداللہ بختانی نے یونس اور ریاض کے دواوین کو مرتب کیا ہے۔ دوست محمد کامل نے کلیات خوشحال خان خٹک، کلیات رحمن بابا (قلندر مومند کی رفاقت میں) اور دیوان سکندر خان خٹک کی تہذیب و تدوین کی ہے۔ قلندر مومند نے دیوان ابوالقاسم اور دیوان صاحبزادہ محمد کو مرتب کیا ہے۔ سید رسول رسا نے ارمغان خوشحال کے نام سے کلیات خوشحال کو مرتب کیا ہے۔ ہمارے چند جوان محققین جیسے عبدالرؤف رفیقی، وکیل شاہ، فقیر خیل وغیرہ نے بھی اس سلسلے میں کچھ کام کیا ہے لیکن اس میدان میں سب سے معتبر

اور سربرآوردہ نام بخش خلیل کا ہے جنہوں نے تن تنہا ایک منظم ادارے سے زیادہ کام کیا ہے(۸۲)

اسی طرح پشتو تحقیق کے کئی گوشوں پر قیام پاکستان کے بعد خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے۔ ان مختلف گوشوں میں ادبی تاریخ نویسی، پشتو کی اصل نسل، لسانیات، گرامر نویسی اور چند دیگر متفرق موضوعات پر بہت اعلیٰ معیار کی تحقیق کی گئی ہے۔ ان گوشوں میں سے پہلے ادبی تواریخ پر تبصرہ کرتے ہیں اور پھر دیگر گوشوں کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

پشتو میں، پشتو زبان وادب کی تاریخ پر خاطر خواہ کام ہوا ہے۔ کچھ محققین نے خصوصی طور پر پشتو نثر کی تاریخ مرتب کی ہے اور کچھ نے پشتو زبان اور نثر و نظم دونوں کے حوالے سے کام کیا ہے۔

پشتو زبان وادب پر ابتدائی کام افغانستان کے دانشور قیام الدین خادم نے "د پشتو نثر تاریخی تطورات" ("پشتو نثر کا تاریخی سفر) کے نام سے کیا ہے۔ یہ کام "کابل کلنی" سالانہ مجلہ میں دو اقساط میں 20-1319ھ میں منظر عام پر آیا تھا۔ صدیق اللہ رشتین، پروفیسر افضل رضا اور بی بی مریم نے پشتو نثر کی تواریخ لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اور معتبر کام عبدالحئی حبیبی صاحب کا ہے جنہوں نے "د پشتو ادبیاتو تاریخ" (پشتو ادب کی تاریخ) کے نام سے دو جلدوں میں کتاب لکھی ہے۔ یہ دونوں جلدیں اب ایک کتاب کی صورت میں بھی دستیاب ہیں۔ حبیبی صاحب نے "د پشتو ادب لنڈ تاریخ" (پشتو ادب کی مختصر تاریخ) کے نام سے ایک نصابی کتاب بھی لکھی ہے جو 1347ھ میں پہلی دفعہ شائع ہوئی ہے۔ افغانستان میں گل پاچا الفت، محمد دین ژواک، شہسوار سنگروال اور صدیق اللہ رشتین نے بھی پشتو نثر اور پشتو زبان وادب کی تاریخ کے حوالے سے کتابیں لکھی ہیں۔ ممتاز محقق زلمے ہیواد مل کی کتاب "پشتو نثر اتہ سوہ کالہ" (پشتو نثر کے آٹھ سو سال) پشتو نثر کی مستند تاریخ ہے۔ زلمے ہیواد مل، ڈاکٹر زیور اور محمد صدیق روہی نے نصاب کے لئے بالترتیب قدیم درمیانی اور جدید ادوار پر مشتمل تاریخیں لکھی ہیں۔

پاکستان کے محققین اور مورخین میں سے شیر افضل خان بریکوٹی کی کتاب "د پشتو شعر و ادب تاریخ" (پشتو شعر و ادب کی تاریخ) اور عبدالحلیم اثر کی کتاب "پشتو ادب" کے علاوہ سید تقویم الحق کاکا خیل، افضل رضا، سید انوار الحق، بلوچستان کے حکیم اللہ صدام، صاحبزادہ حمید اللہ وغیرہ نے بھی پشتو زبان، نثر اور نظم کے حوالے سے تاریخی آثار یکجا کیے ہیں۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک، ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ حقاب خٹک، نواز خٹک، خواجہ محمد سادل وغیرہ کی تحریروں میں بھی کچھ آثار موجود ہیں۔

گرامر نویسی

پشتو میں گرامر اور قواعد نویسی کے حوالے سے ابتدائی کام مستشرقین نے کیا ہے۔ مستشرقین سے پہلے کچھ آثار موجود ہیں لیکن ان میں لغات اور دیگر موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کے ساتھ قواعد کو بھی منسلک کر کے پیش کیا گیا ہے جیسے نواب محبت خان کی لغت ریاض المحبت اور نواب ارتضیٰ خان کی فرہنگ ارتضائی وغیرہ میں گرامر کا حصہ بھی دیا گیا ہے۔ مستشرقین میں پروفیسر کلاپرٹ، پروفیسر ڈورن، میجر ایچ جی راورٹی، میجر پیچ، کیپٹن وان، ڈاکٹر ٹرمپ اور بلیو نے منظم طور پر گرامر نویسی پر کام کیا ہے۔ افغانستان و پاکستان کے دانشوروں میں میر احمد شاہ رضوانی، راحت زاخیلی، محمد گل خان مہمند، صدیق اللہ رشتین، عبد الحلیم اثر، حافظ محمد ادریس، سید تسلیم الحق کاکا خیل، عظیم شاہ خیال بخاری، ڈاکٹر مجاور احمد زیار، صاحبزادہ حمید اللہ، عبد الرزاق پاول، ڈاکٹر زرغونہ رشتین اور عبد الکریم بریالے نے اس ضمن میں قابل ذکر کام کیا ہے جو مختلف اداروں کی جانب سے تسلسل سے شائع ہوتا رہا ہے۔

پشتونوں کی اصل نسل

پشتونوں کے اصل نسل اور بنیاد پر فارسی میں نعمت اللہ ہروی نے تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی کے نام سے کتاب لکھی ہے جس میں پشتونوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نعمت اللہ ہروی مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار میں منشی تھی۔ انہوں نے یہ کتاب نواب خان جہان کی مشاورت اور ہیبت خان کی سرپرستی میں لکھی۔ اس کتاب کے لکھنے کا اصل محرک تاریخ فرشتہ ہے جس میں مطلع الانوار نامی کتاب کے حوالے دیے گئے۔ اس کا مقصد پشتونوں کے بارے میں غلط معلومات کا ازالہ کرنا تھا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے کیا جو مرکزی اردو بورڈ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

پشتو میں خوشحال خان خٹک کی شدید خواہش کے باوجود وہ پشتونوں کی اصل نسل پر کتاب تو نہ لکھ سکے مگر اپنی ایک اور کتاب دستار نامہ میں اس نظریے کی تائید کر گئے کہ پشتون نسلاً بنی اسرائیل ہیں۔ اخوان درویزہ بابا نے اپنی کتاب مخزن الاسلام اور خوشحال خان خٹک کے پوتے افضل خان خٹک نے اپنی کتاب تاریخ مرصع میں اسی نظریے کی تائید میں مباحث دیے ہیں۔ اس نظریے کی تائید میں خان روشن خان نے ''تذکرہ، پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ'' کے نام سے اردو میں کتاب لکھی جو پہلی

بار 1980ء میں اور پچھلی بار دسمبر 1992ء میں شائع ہوئی۔ روشن خان کی ایک اور کتاب یوسفزئی قوم کی سرگزشت بھی اردو میں لکھی گئی ہے اور پہلی بار 1984ء میں شائع ہوئی ہے۔

سردار شیر محمد خان گنڈاپور کی کتاب تاریخ خورشید جہاں اور محمد حیات خان کی حیات افغانی خان روشن خان کی کتابوں سے پہلے شائع ہوئی تھی۔ یہ دونوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ تاریخ خورشید جہاں کا ترجمہ تاریخ پشتون کے نام سے سراج احمد علوی نے کیا ہے اور حیات افغانی کی دونوں جلدوں کا پشتو میں ترجمہ کر کے دانش کتب خانہ پشاور نے ایک کتاب کی صورت میں 2007ء میں شائع کیا۔ سید عبدالجبار شاہ کی کتاب بنی اسرائیل یا ملک افاغنہ، پیر معظم شاہ کی تواریخ حافظ رحمن خانی، حافظ رحمان خان کی خلاصۃ الانساب، اللہ بخش یوسفی کی تاریخ یوسفزئی پٹھان، زردار خان کی صولت افغانی، اس سلسلے کی دوسری تواریخ ہیں جو اردو فارسی میں لکھی گئی ہیں اسی طرح میراجان سیال مہمند، عبداللطیف طالبی یاد، عبدالعلی غورغشتی وغیرہ نے پشتونوں کے شجروں پر کام کیا ہے۔

جن مورخین نے پشتونوں کی اصل نسل کی کڑی آریاؤں سے جوڑی ہیں ان میں عبدالحئی حبیبی کی "پښتو ادبیاتو تاریخ" (تاریخ ادبیات پشتو) میں تحقیقی مباحث اور خصوصی طور پر سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل کی دو کتابیں "پښتانه د تاریخ په رڼا کښې" (پشتون تاریخ کے آئینے میں) اور اردو کتاب پشتون اپنی نسل کے آئینے میں قابل ذکر ہیں۔ متفرق تواریخ میں مقاب خٹک کی تاریخ خٹک (اردو) گوپال داس کی تاریخ پشاور (اردو) قابل ذکر ہیں۔ احمد علی کہزاد کی فارسی کتاب تاریخ افغانستان میں بھی پشتونوں کی اصل نسل پر تحقیق کی گئی ہے۔

انگریزی میں اس موضوع پر زیادہ کام مستشرقین نے کیا ہے۔ پروفیسر ڈورن نے مخزن افغانی کا انگریزی ترجمہ History of the Afghans کے نام سے کیا ہے۔ سر اولف کیرو کی شہرہ آفاق کتاب The Pathans پہلی بار 1958ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا اردو اور پشتو میں ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ جے ڈبلیو سپین کی کتابیں The Pashtoon Borderland اور the way of the Pathans میں یہ مباحث سامنے لائے گئے ہیں۔ الفنسٹن کی کتاب An Account on the Kingdom of Kabul میں بھی پشتونوں کی اصلیت پر تحقیق کی گئی ہے۔ اس طرح چند دیگر مستشرقین جیسے جیمز ڈارمس، بیلو، فریزر، آر ٹی رج وے کی تحقیق اور فاروقی کی کتب the Afghans in India بھی اس سلسلے کی اہم کتاب ہے۔ غنی

خان نے اپنی انگریزی کتاب The Pathan میں پشتونوں کو یونانی ثابت کرنے کے لئے دلائل دیے ہیں۔ مستشرق مارگن سٹائرن نے لسانی حوالے سے پشتونوں کو یونانی ثابت کرنے کے لئے دلائل دیے ہیں۔ مستشرق مارگن سٹائرن نے لسانی حوالے سے پشتونوں کی اصل نسل جانچنے کی کوشش کی ہے جس کی تائید پشتون دانشوروں میں ڈاکٹر مجاور احمد زیار اور گل مان شیر آفریدی نے بھی کی ہے۔ سلطان محمد صابر، مولانا عبدالقادر، مظفر حسن ملک اور چند دیگر پشتون مورخین نے بھی اس سلسلے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔

ان مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ محققین و مورخین کیلئے یہ موضوع خاصا دلچسپ رہا ہے۔ پشتونوں کی قدامت کی وجہ سے ان کی نسلی کڑی کو دریافت کرنے کی لئے فارسی، اردو، پشتو اور انگریزی میں اتنا کام ہوا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ پشتو کے علاوہ دیگر زبانوں میں کی گئی تحقیق اگرچہ پشتو تحقیق میں شامل نہیں مگر پشتونوں کے اس حوالے سے اتنے اہم اور پھیلے ہوئے کام کو کسی بھی زبان میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لسانیات

پشتو میں لسانیات کے حوالے سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ جن دانشوروں نے پشتو زبان وادب کی تواریخ لکھی ہیں ان میں کہیں کہیں پشتو زبان کی بنیاد، اصل نسل لہجوں اور دوسرے پہلوؤں پر مختصر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مختصر اظہار خیال میں بھی عموماً تاریخی لسانیات (Historical Linguistics) پر لکھا گیا ہے لسانیات کے جدید سائنسی اصولوں اور جدید علمی بنیادوں پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ سید فارغ بخاری نے ادبیات سرحد کی جلد سوم میں اردو کے بنیادی ماخذ پر تبصرہ کرتے ہوئے پشتو زبان کے تاریخی پس منظر پر بھی مختصر اظہار خیال کیا ہے۔ رضا ہمدانی اور قاخر غزنوی نے بھی پشتو زبان کے بارے میں اردو میں لکھا ہے۔ "قومی زبان کی ترقی میں صوبوں کا حصہ" نامی کتاب جو اعجاز راہی کی مرتبہ اور مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی ہے، میں رضا ہمدانی نے صوبہ سرحد کی زبان پشتو کے بارے میں تبصرہ کیا ہے۔ خاطر غزنوی کی کتاب "اردو کا ماخذ ہندکو" میں بھی پشتو زبان پر بات کی گئی ہے۔ سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل اور سید تقویم شاہ خیال بخاری نے پشتو زبان کے قواعد لکھتے ہوئے زبان کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ امتیاز علی خان عرشی صاحب نے "اردو میں پشتو کا حصہ" میں

پشتو زبان کے تاریخی پس منظر اور اردو کے ساتھ لسانی اور نحوی اشتراک پر تحقیق کی ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، میمن عبدالمجید سندھی اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی پشتو زبان کے تاریخی آثار کو ڈھونڈ نکالا ہے، لیکن یہ تمام کام اردو میں ہوا ہے۔ اس طرح انگریزی میں بھی مستشرقین نے اپنے مطبوعہ آثار میں بکھرا ہوا کام کیا ہے۔ خالد خان خٹک، پرویز شاہین، عبدالکریم بریالے، سیال کاکڑ، صاحبزادہ حمید اللہ، ڈاکٹر سہیل انشاء، خادم حسین عامر اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے وابستہ کچھ طلباء نے اردو، انگریزی اور پشتو میں لسانیات اور پشتو لسانیات کے بارے میں لکھا ہے۔

افغانستان کے محققین نے زیادہ کام پشتو میں کیا ہے لیکن اس کام میں لسانیات کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ پروفیسر عبدالحئی حبیبی، صدیق اللہ رشتین اور قیام الدین خادم نے تاریخی لسانیات کے موضوع پر ادبی کتابوں میں کچھ حصے اور متفرق مضامین لکھے ہیں۔ پشتون ماہرین لسانیات میں مستند نام پروفیسر محمد رحیم الہام اور ڈاکٹر مجاور احمد زیار کے ہیں۔ محمد رحیم الہام نے افغانستان کی یونیورسٹیوں میں لسانیات کا مضمون پڑھایا بھی ہے اور لسانیات کے حوالے سے متفرق مضامین بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر مجاور احمد زیار نے سویٹزرلینڈ سے پشتو لسانیات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی لی ہے اور عملی طور بھی تاریخی اور تشکیلی لسانیات پر کام کیا ہے۔ ڈاکٹر زیار نے پشتونوں کی تاریخ بھی لسانیات کی روشنی میں لکھ کر شائع کی ہے۔ مجموعی لحاظ سے پشتو میں سائنسی بنیادوں پر لسانیاتی تحقیق کا میدان خالی ہے۔

تحقیق کا ایک پہلو وہ بھی ہے جو مختلف یونیورسٹیوں میں باقاعدہ سندی تحقیق کے ضمن میں ماسٹر، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر مقالہ جات لکھے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں پشتو زبان و ادب کے متفرق پہلوؤں پر ان گنت تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں جن میں کچھ کتابی صورت میں اشاعت پذیر بھی ہوئے ہیں مگر زیادہ مقالات کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکے۔ سندی تحقیق کے مقالات کے ساتھ ساتھ کوئی تحقیقی موضوعات پر انفرادی ذاتی طور پر بھی مقالے لکھے گئے ہیں جو مختلف رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ یہاں ہم ان متفرق موضوعات کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جو زبان و ادب کے علاوہ دیگر سماجی علوم کے بارے میں تحقیق کو سامنے لاتے ہیں۔

کچھ محققین نے فلسفہ، سیاسیات، مذہبیات، بشریات، جغرافیہ، طب، اقتصادیات اور دیگر موضوعات پر تحقیقات کی ہیں۔ فلسفہ کے موضوع پر ارباب سکندر خان خلیل نے "فلسفہ زوړه او نوے" (فلسفہ قدیم و جدید) اور "ادبی فلسفہ" (عصری فلسفہ) کے نام سے پشتو میں کتابیں لکھی ہیں۔

اسی طرح اقتصادیات کے موضوع پر انہوں نے ایک کتاب "د اقتصاد یا تو خلاصہ" (خلاصہ اقتصادیات) کے نام سے اور "قامیت" (قومیت) قومی شعور کے حوالے سے ایک کتاب لکھی ہے۔

تحقیقی کام قابل قدر اضافہ ہے۔ مذہبی موضوعات پر میاں ظاہر شاہ قادری، فقیر محمد عباس قادری، پروفیسر انعام اللہ جان قیس، پروفیسر عارف تسیم اور حافظ شریف احمد افغانی نے خاطر خواہ توجہ دی ہے۔

سیاسی موضوعات پر عبدالغفار خان (باچا خان)، احمد کا ولی خان، اجمل خٹک، افضل خان لالہ، افراسیاب خٹک، سلیم راز اور چند دیگر نظریاتی اور نیشنلسٹ سیاستدانوں نے لکھا ہے جن میں ولی خان کی کتاب "حقائق حقائق دی" (حقائق حقائق ہیں) اور "باچا خان اور خدائی خدمتگاری" زیادہ نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر حسین شاہ کی کتاب "پښتني قومي جوړښت" (پشتونوں کی نسلی ساخت) بشریات (Anthropology) اور پشتونوں کی بنیاد (Origin of Pashtoons) کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب ستمبر 2001ء میں پاکستان ادبی جرگہ پشاور کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ عبدالرؤف نوشہروی نے کیسا اور نواز طائر نے جغرافیہ کے بارے میں کچھ کام کیا ہے۔ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی نے اس سلسلے میں مختلف سکالروں سے متفرق کام کروایا ہے۔

مجموعی تبصرہ

پشتو میں تحقیقی کام بکھرا پڑا ہے اور مختلف نشیب و فراز سے گزرا ہے۔ ان تمام تحقیقات میں بہت کم کتابیں ایسی ملیں گی جو کسی حد تک تحقیقی اصول و قواعد پر پوری اتر سکیں۔ سینئر محققین میں دوست محمد کامل کے بعد سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل ایسے محقق ہیں جنہوں نے تحقیقی اصول کی کسی حد تک پاسداری کی ہے۔ عبدالحئی حبیبی اور عبدالرؤف بینوا کی تحقیق بھی کسی قدر اصولوں کے مطابق ہے لیکن افغانستان میں کی گئی تحقیق میں کوئی تشنگی پائی جاتی ہے البتہ جدید دور میں ڈاکٹر مجاور احمد زیار، زلمے ہیوادمل اور حبیب اللہ رفیع کی تحقیق مستند اور اصولوں کے مطابق ہے۔ عبدالحلیم اثر افغانی اور عقاب خٹک کی تحقیق میں بھی بہت خامیاں پائی جاتی ہیں۔ ہمیش خلیل، اجمل خٹک، قلندر مومند اور ایوب صابر کی تحقیق نسبتاً اصولوں کے مطابق اور تسلی بخش ہے۔ آج کل کافی محققین تحقیق کے جدید اصول (Universal Research Methodology) سیکھ رہے ہیں اور اس کے مطابق تحقیق کر رہے ہیں۔ اس سلسلے

میں زیادہ امیدیں جامعات سے منسلک اساتذہ صاحبان کی نگرانی میں ہونے والی تحقیقات سے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

پشتو میں تحقیق کا یہ سفر جاری وساری ہے اور کئی نوجوان محققین اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ تحقیق کا یہ سفر جو قیام پاکستان سے پہلے شروع ہوا تھا اور پھر قیام پاکستان کے بعد بڑی شدت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ آج اتنی زیادہ مسافت طے کر چکا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا ہی مشکل ہو گیا ہے۔

تنقید

پشتو میں تنقیدی نظریات کی بازگشت عرصہ قدیم سے سنائی دے رہی ہے۔ یہاں تک کہ سولہویں صدی عیسوی میں روشنیہ تحریک سے وابستہ ادیبوں اور پھر پشتو کے کلاسیکل دور سے ہی تنقیدی نظریات موجود ہیں مگر جہاں تک جدید طرز تنقید کا تعلق ہے تو اس کا آغاز قیام پاکستان کے بعد ہی ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر ناقدین اور محققین نے پشتو میں جدید تنقید کو رواج دینے کا اصل مرحلہ اولسی ادبی جرگہ کے قیام کو گردانا ہے اور اس ادبی جرگہ کی تاسیس کا سہرا کاکاجی صنوبر حسین، امیر حمزہ شنواری اور دوست محمد خان کامل کے سر ہے۔ جنہوں نے مارچ ۱۹۵۳ء میں اس جرگے کی بنیاد رکھی تھی۔ اگرچہ ہمارے عہد کے نامور نقاد سلیم راز صاحب اولسی ادبی جرگہ کے قیام سے بھی پہلے پشتو میں جدید تنقید کے رواج کے حامی ہیں اور ریاض تسنیم کے ایک سوال کے جواب میں اپنے دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں۔

میں اس بات کے ساتھ تھوڑا سا اختلاف کرتا ہوں۔ اسی لیے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین بنی تھی۔ یہ تحریک اپنے ساتھ تنقیدی اصول بھی لائی تھی۔ تو اردو کے ذریعے یہ اصول پشتو تک پہنچ چکے تھے۔ اولسی ادبی جرگہ میں بھی ترقی پسند لوگ آکر بیٹھ گئے تھے۔ پشتو میں پہلی مرتبہ اولسی ادبی جرگہ نے تنقیدی نشستوں کا آغاز کیا تھا۔ انجمن کے ممبران فارغ بخاری اور رضا ہمدانی وغیرہ اولسی ادبی جرگہ کی نشستوں میں شامل ہوتے تھے اور کاکاجی صنوبر حسین مومند انجمن کے صوبائی صدر ہونے کے ساتھ ساتھ جرگہ کے صدر بھی تھے(۹۸)

مگر سلیم راز صاحب کی اس وضاحت سے پھر بھی یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ پشتو میں جدید تنقید کا رواج کاکاجی صنوبر اور دیگر ترقی پسند دانشوروں نے دیا ہے۔ ان ترقی پسندوں کے علاوہ دوست محمد خان کامل، قلندر مومند، ہمیش خلیل، ایوب صابر اور کئی دیگر ناقدین نے اپنا کردار ادا کیا ہے جس میں اکثر و بیشتر کا تعلق اولسی ادبی جرگہ ہی سے تھا اور جن کی تربیت کاکاجی صنوبر، حمزہ شنواری اور دوست محمد خان کامل نے کی تھی۔

اولسی ادبی جرگے کے محسنوں میں کاکاجی صنوبر حسین، دوست محمد کامل اور امیر حمزہ شنواری

کے نام سرفہرست ہیں۔ ان میں کاکاجی صنوبر حسین نے فارسی، عربی، انگریزی، روسی اور اردو ادب کو بنظر غائر پڑھا تھا اور ان میں سے کئی زبانوں سے تراجم بھی کر چکے تھے۔ دوست محمد کامل 1938-39ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے قانون اور فلسفہ میں اسناد لے چکے تھے اور ساتھ ہی انگریزی، فارسی، اردو اور پشتو میں براہ راست ان کی کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی طرح امیر حمزہ شنواری نے اردو کے ذریعے جرمن، روسی، انگریزی اور براہ راست اردو ادب کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ یوں بین الاقوامی ادب کے اس وسیع تر تناظر میں یہ لوگ پشتو ادب میں جدید رجحانات اور تنقیدی نظریات کو متعارف کرانے میں کوشاں رہے۔ خصوصی طور پر کاکاجی صنوبر حسین مرحوم کے بارے میں افگار عارف نے بھی اشارہ کیا ہے کہ:

"محقق، نقاد، شاعر، مقالہ نگار، مترجم، عالم کاکاجی صنوبر حسین مہمند کا انگریزی، روسی، فارسی، عربی اور اردو زبان و ادب میں انتہائی وسیع مطالعہ تھا۔ وہ پشتو ادب میں بھی عالمی ادبی اقدار کو متعارف کروانا چاہتے تھے۔ ساری زندگی انہوں نے پشتو زبان و ادب کی ترقی اور پشتو میں نئے ادبی رجحانات کو رواج دینے کی خاطر بہت محنت اور تسلسل کے ساتھ کام کیا"(۸۰)

کاکاجی صنوبر اور اولسی ادبی جرگہ نے پشتو تنقید کے ارتقاء میں جو کردار ادا کیا ہے اس کے بارے میں میں نے اپنی کتاب کاکاجی صنوبر شخصیت اور فن میں لکھا تھا:

کاکاجی صنوبر کا اصل کارنامہ پشتو جدید ادب میں تنقید کو رواج دینا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ کہ اپنے ہم عصروں میں کاکاجی صنوبر کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انہوں نے بیک وقت مشرق و مغرب کے تنقیدی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کامریڈ ہونے کی وجہ سے انہوں نے روس کے تنقیدی ادب کو بھی پڑھا تھا۔ فارسی و عربی ادب پر کافی عبور حاصل کیا تھا۔ اردو اور پشتو ادب کے تو وہ جید عالم اور نقاد تھے۔ اپنے اسی کثیر الجہت مطالعہ کی روشنی میں آپ نے پشتو تنقید کو وہ وسعت دی جس کی بنا پر آج پشتو ادب تنقیدی سرمایہ سے مالا مال ہے(۸۱)

سلیم راز نے اس حقیقت کا ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

He had a vast study, keen observation experience and these qualities had made him distinguished among his (۸۲)contemporaries

کاکاجی صنوبر نے پشتو ادب میں تنقید کو عام کرنے کے لئے اولسی ادبی جرگہ کے پلیٹ فارم کو

بہت حد تک استعمال کیا۔ اس تنظیم کے زیر سایہ انہوں نے پشتو کے ایسے نقادوں کی تربیت کی جو آج پشتو کے جدید ادب اور خصوصی طور پر پشتو تنقید ادب کے معتبر نام ہیں۔ اسی تنظیم کے زیر سایہ انہوں نے پشتونوں کو ترقی پسندی کا مفہوم سمجھایا اور پشتونوں کی روشن فکری، ادب میں مثبت اختلاف رائے اور ترقی پسند نظریات کو رواج دینے کی تحریک چلائی۔ بقول سلیم راز:

''یہ جو آج پشتو ادب میں انقلاب اور ترقی کے حوالے سے بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں ان کی تربیت کاکاجی صنوبر نے کی ہے۔ آج پشتو میں تنقیدی بصیرت اور سماجی شعور سے مالا مال ادب موجود ہے اس کی بنیاد کاکاجی صنوبر نے رکھی تھی۔ آپ نے اولسی ادبی جرگہ میں ادیبوں کی ذہنی نشو و نما اور فکری رہنمائی کی۔ کاکاجی صنوبر اس جرگہ کے بانیوں میں سے تھے۔ دیگر ممبران میں دوست محمد خان کامل اور امیر نے تنقید برداشت کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ کاکاجی صنوبر نے اولسی ادبی جرگہ میں قائدانہ کردار ادا کیا جس سے آج کی نسل بہت متاثر ہے۔ بقول ولی محمد خان کاکاجی پشتو کے جدید دور کے ادب کا معمار ہے(۸۳)

چونکہ کاکاجی صنوبر نے پشتو میں جدید تنقید کی روایت کی اولسی ادبی جرگہ کے زیر سایہ فروغ دیا تھا لہذا ہمارے عصر کے اکثر دانشوروں نے ان کی تنقیدی بصیرت اور جدید نقادوں کی تربیت کے ضمن میں اولسی ادبی جرگہ کا تذکرہ ضرور کیا ہے اور کاکاجی کو جدید تنقید کا بانی اور بنیاد قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو روشن کرنے کیلئے چند حوالے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

بیسوی صدی کے سب سے ممتاز، نقاد اور محقق نقاد دوست محمد کامل لکھتے ہیں:

''کاکاجی اولسی ادبی جرگے کے اجلاسوں میں خود تنقید کرتے وقت بڑی احتیاط اور دور اندیشی سے کام لیتے تھے۔ تمام ممبران کی رائے کو بڑے غور سے سنتے اور سب سے آخر میں اپنی رائے کا اظہار کرتے اور بڑے ذمہ دارانہ اور موثر طریقے سے کرتے اور جس غور سے ان فن پاروں کو پرکھتے اور ان پر تنقید بھی بڑی توجہ سے سنتے اور پسند بھی کرتے۔ میں نے اس کو ایسا محسوس کیا کہ اس کے اظہار کے لئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں(۸۴)

رضا ہمدانی لکھتے ہیں:

''علاقہ غیر سے واپسی پر انہوں نے اپنی تمام تر توجہ ادب پر مرکوز کر دی تھی۔ ان کی ادبی انجمن نے پشتو شعر و ادب کی دنیا میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی۔ اس کے ذریعے پشتون شعراء کی نئی پود کی

ذہنی تربیت کی گئی اور کھلے بندوں تنقید کو رواج ملا۔ ان کی شعر گوئی میں سماجی شعور، حقیقت پسندی، وسیع النظری اور جدت و ندرت کا اضافہ ہوا۔ نظم کے ساتھ نثر نے بھی پر پرزے نکالے۔ پشتو نثر اپنے گرد و پیش کے علاوہ بین الاقوامی تقاضوں سے بھی آشنا ہوئی۔ پشتو افسانے میں جدید تقاضوں کو درخور اعتنا سمجھا گیا۔ آفاقی نظریات کو جگہ دی گئی اور اس طرح بزرگ شعرا، ادبا کے دوش بدوش ایک تازہ دم کھیپ بھی معاشرے اور ادب کو مل گئی۔ جس کے وجود نے شعر و ادب کی یکسانیت اور جمود کو ختم کر دیا۔ کاکاجی کی ہمہ گیر شخصیت کی کشش نے پشتو اردو کے جملہ ادبا و شعراء کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ان کے گرد و پیش بیٹھنے والوں میں یکسئی فکر، عقائد مذہبی و سیاسی، رنگ و نسل اور زبان کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ اردو، فارسی اور پشتو کے سب فنکار کاکاجی کی محفل میں بیٹھ کر محظوظ ہوتے"(۸۵)

جناب قمر راہی لکھتے ہیں:

انھوں نے بکھرے ادیبوں کو یکجا کرنے کے لئے اولسی ادبی جرگہ بنایا۔ میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج جو ہم میں کوئی تنقیدی شعور ہے یا ادب کے کسی موضوع پر گفتگو کر سکتے ہیں تو یہ سب کاکاجی کی کرم فرمائیاں ہیں(۸۶)

ممتاز نقاد و محقق رحمت اولسی ادبی جرگہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

اولسی ادبی جرگے نے پشتو ادب کو بہت کچھ دیا۔ ادیبوں شاعروں کا یکجا بیٹھنا ادب پر غور و فکر کرنا اور تنقید برداشت کرنا، ان اجلاسوں کی کارروائی تحریر میں لانا، جس پر وہ آج عمل پیرا ہیں۔ اولسی ادبی جرگہ وقت کی اہم ضرورت تھی(۸۷)

بیسوی صدی کے ممتاز شاعر و دانشور امیر حمزہ شنواری یوں رقمطراز ہیں:

"ہمارے اولسی ادبی جرگہ نے ادب اور خاص کر تنقید کے بارے میں بہت بڑا کام کیا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اولسی ادبی جرگہ کے قیام سے پہلے ادب میں تنقید نام سے کوئی چیز موجود نہیں تھی، کوئی جانتا ہی نہیں تھا(۸۸)

ایوب صابر اس جرگے کے اراکین کی تنقیدی خدمات پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"پشتو تنقید کا ذکر کرتے ہوئے میں ضمناً اس امر پر روشنی ڈال چکا ہوں کہ اس صنف سے پشتو ادب کو "اولسی ادبی جرگہ" نے روشناس کرایا اور یہ صرف تنقید پر موقوف نہیں ہے تقریباً تمام جدید اصناف سخن کو پشتو ادب میں داخل کرنے کا سہرا اولسی ادبی جرگہ کے سر ہی سمجھتا ہوں۔

پشتون ادیبوں کے اس نمائندہ جرگہ کے جن اراکین نے پشتو ادب میں بہترین تنقیدی مقالات کا اضافہ کیا ان میں کاکاجی صنوبر حسین، امیر حمزہ شنواری، دوست محمد خان کامل، اجمل خٹک، مہندی شاہ مہدی، ولی محمد طوفان، قلندر مومند، مجتبیٰ خلیل اور راقم الحروف شامل ہیں۔ ان میں سے دوست محمد خان کامل اور قلندر مومند نے تنقید کے میدان میں جو معیار قائم کیا ہے اس پر پشتو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

دوست محمد خان کامل نے اگر ایک طرف خوشحال خان خٹک اور رحمن بابا پر تنقیدی مقالات لکھے تو دوسری طرف نواز خٹک، اشرف خان ہجری، سکندری خان خٹک اور کاکاجی صنوبر حسین وغیرہ کے فنی محاسن و معائب بھی بیان کئے(۸۹)

یوں نظری اور عملی تنقید کے دونوں پہلوؤں پر پشتو میں باقاعدہ لکھنا شروع ہوگیا۔ کچھ ایسے بھی نام سامنے آئے جو اولسی ادبی جرگے سے منسلک تو نہیں تھے لیکن انہوں نے اس جرگے کی بنائی ہوئی تنقیدی روایت کو آگے بڑھایا اور پشتو تنقید میں کافی کام کیا۔

نظری تنقید میں سید رسول رسا کی کتاب "ادبی تنقید" ایک اہم قدم ہے اس کتاب کے مندرجات پر ایوب نے تبصرہ کرتے وقت اس خیال کا اظہار کیا ہے:

"سید رسول رسا کی کتاب "ادبی تنقید" اس اعتبار سے ایک عمدہ کوشش ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد قارئین کی سمجھ میں یہ باتیں بڑی آسانی سے آجاتی ہیں کہ آرٹ یا فنون لطیفہ کی تعریف کیا ہے۔ آرٹ کا مقصد کیا ہے شعر کس کو کہتے ہیں۔ مکمل شعر کی کیا پہچان ہے۔ ناطق شاعر اور گونگے شاعر میں کیا فرق ہے۔ پیغمبرانہ الہام اور شاعرانہ الہام میں کیا فرق ہے۔ شعر موزوں کرتے وقت شاعر کی دماغی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ شعر کی کیا ضرورت ہے۔ شاعری اور تک بندی میں کیا فرق ہے۔ نظم اور شعر میں کیا فرق ہے۔ شاعری میں آمد کس کو کہتے ہیں اور آورد کس کو کہتے ہیں۔ شعر کا تانا بانا کیسے بنا جاتا ہے اور شاعری کی حقیقت کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

سید رسول رسا نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے فن تنقید پر لاتعداد کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور پھر اپنے حاصل مطالعہ کو پشتو کے قالب میں ڈھال کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ وہ پشتو کے ایک ذہین اور صاحب طرز محقق سکالر ہیں۔ انہوں نے اب تک پشتو ادب کو بہت کچھ دیا ہے اور اس کے علاوہ بہت کچھ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں(۹۰)

سید رسول رسا کی کتاب یقیناً بہت اچھی کتاب ہے لیکن اس کے مندرجات کافی حد تک الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے متاثر ہیں۔ حالی کا مقدمہ خود مغربی نقاد اور شاعر جان ملٹن کے تنقیدی نظریات سے متاثر ہے۔ سحر یوسفزئی کی کتاب "ادب سنه ذے" اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مختلف اصناف جیسے شخصیت نگاری، ادب، تنقید، ناول، ڈرامہ، افسانہ، انشائیہ اور دیگر اصناف پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ عبدالکافی ادیب کی کتاب "خورے پانڼے" (بکھرے اوراق) بھی اس مزاج کی ہے۔ اس قسم کی کتابیں اردو میں کافی لکھی گئی ہیں لیکن اردو والوں نے ولیم ہنری ہڈسن کی انگریزی کتاب An Introduction to the Study of Literature سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا باب "تنقید" اور ارسطو کی کتاب بوطیقا (Poetics) کے پشتو تراجم قلندر مومند نے کیے ہیں۔ جن سے پشتو کو نظری تنقید عام کرنے میں بہت مدد ملی۔ افضل رضا کی کتاب تحقیق و تنقید اس سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ افغانستان اور بلوچستان میں بھی کچھ بکھرا ہوا کام ہوا لیکن اس سلسلے میں سلیم راز کی کتاب "تنقیدی کرښې" (تنقیدی سطریں) خصوصی اہمیت کی حامل ہے جس میں نظری تنقید بھی ہے اور عملی تنقید بھی۔ ادب میں مقصدیت اور ترقی پسند رجحان پر سیر حاصل گفتگو کے ساتھ ساتھ کچھ ترقی پسند شخصیات کے فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر رب نواز مائل کی کتاب "ادب، تنقید، فکر" اور ایاز داؤدزئی کی کتاب "ادبی حسی" (ادبی وژن) میں کچھ مواد تنقید میں نظری مباحث پر مشتمل ہے۔ مردان سے شائع ہونے والے کتابی سلسلہ "مرکز" کے تنقید نمبر میں بھی کافی مواد نظری تنقید کے حوالے سے مل سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے متفرق مقالے لکھے ہیں جیسے ایوب صابر کے "آزاد نظم" پر مباحثے، قاضی احمد سعید کا "تنقید کیا ہے" کے بارے میں نظریات، ہمیش خلیل، قلندر مومند، اجمل خٹک، پریشان خٹک، الطاف خٹک، ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ وغیرہ کے مختلف اصناف و موضوعات پر مقالے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔

پشتو تنقید میں ترقی پسند تصورات کی ترجمانی کرتے ہوئے چند ترقی پسند ناقدین کی تنقیدی خدمات کے حوالے سے میں نے اپنی کتاب "پشتو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات" میں خصوصی تبصرہ کیا ہے اس کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے مختصراً اظہار خیال یوں کیا جا سکتا ہے۔

کاکا صنوبر جی کے ترتیب کردہ دیگر ترقی پسند ناقدین میں اجمل خٹک، ولی محمد طوفان، قلندر مومند، ایوب صابر، ہمیش خلیل، فضل حق شیدا، قمر راہی، سیف الرحمن سلیم وغیرہ کے نام زیادہ نمایاں ہیں

لیکن پشتو کے تنقیدی سرمایہ کو دیکھتے ہوئے ہم ترقی پسند ناقدین میں سے اجمل خٹک، ایوب صابر، قلندر مومند اور جناب سلیم راز کے تنقیدی افکار کو بطور خاص اجاگر کر سکتے ہیں۔

اجمل خٹک صاحب نے اولسی ادبی جرگہ کی تنقیدی نشستوں میں مجلسی تنقید اور نظری مباحث کے علاوہ اپنے متفرق مقالات، تبصروں، انٹرویوز اور مختلف کتابوں کے دیباچوں اور مقدموں میں اپنے تنقیدی نظریات پیش کیے لیکن ترقی پسند تنقید کے حوالے سے ان کی کتاب "ژوند او فن" (زندگی اور فن) کا خصوصی طور پر حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ادبی ملگری پشاور کے زیر اہتمام 1967ء میں اشاعت پذیر ہونے والی اس کتاب میں منتخب ترقی پسند شعراء کے کلام کو شامل کیا گیا ہے اور 42 صفحات پر مشتمل ایک مضمون "ژوند او فن" کے نام سے شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اجمل خٹک صاحب نے زندگی اور فن کے تعلق، ادب اور مقصدیت، حقیقت پسندی اور ترقی پر سیر حاصل بحث کی ہے اور پشتو ادب میں ترقی پسند رجحان کی نشاندہی کی ہے۔

ایوب صابر نے اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں ترقی پسند نظریات کی حامل شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید میں بھی ترقی پسند رجحان کو مدنظر رکھا ہے۔ میر عبدالصمد خان نے ان کی تنقید کے بارے میں لکھا ہے:

"جب ترقی پسند مصنفین کی تحریک زوروں پر تھی۔ یہ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں انہوں نے زیادہ کام بصارت سے لیا ہے لیکن بعد میں ان کی چشم بصیرت بھی وا ہونے لگی۔ اب وہ کسی تحریک سے تو وابستہ نہیں ہیں البتہ ان کی منظومات اور نثری نگارشات میں محبت اور پیٹ کی بھوک دونوں کا رونا رویا جاتا ہے۔ وہ مزاح نگاری میں بھی سرمایہ داری کا سینہ فگار کرنے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ اردو، پشتو دونوں میں تحقیقی مقالے اور تنقید مضامین بھی لکھ رہے ہیں۔(۹)

"رحمان بابا اپنے عصر کا ترقی پسند شاعر" کے عنوان سے کاکاجی صنوبر حسین، فضل حق شیدا، قلندر مومند اور سلیم راز نے مختلف مضامین میں اپنے ترقی پسندانہ تنقیدی نظریات کی توضیح کی ہے۔ قلندر مومند نے چند دیگر مضامین میں بھی ترقی پسند رویوں کی ترجمانی کی ہے۔ اسی طرح ولی محمد طوفان، اجمل خٹک صاحب، شاہ و صابر، الطاف خٹک وغیرہ کے چند مضامین کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں سب سے معتبر نام جناب سلیم راز کا ہے جنہوں نے نہ صرف مختلف مقالوں، مباحثوں، ریڈیو اور ٹی وی

کے پروگراموں اور اخباری کالموں میں ترقی پسند تنقیدی رویوں کی تشریح کی ہے بلکہ اپنی کتاب "تنقیدی کرنے" (تنقیدی سطریں) میں بھی وہ مکمل طور پر ایک ترقی پسند نقاد کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔

سلیم راز صاحب نے اپنی اس کتاب میں دس ترقی پسند ادیبوں کے فن پاروں اور افکار کا جائزہ لیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ایک مضمون "زندگی، ادب اور تنقید" کے تعلق پر لکھا ہے۔ اپنے مضمون میں انہوں نے ترقی پسند رجحان کو تنقید اور ادب کا بنیادی عنصر قرار دیا ہے اور ادب برائے زندگی کے نظریے کی بھرپور وضاحت کی ہے۔ شخصیات میں کاکاجی صنوبر، فارغ بخاری، سیف الرحمن سلیم اور ایوب صابر کو کلی طور پر ترقی پسند دانشوروں کی شکل میں پیش کیا ہے اور ساتھ ساتھ دوست محمد خان کامل، سیدہ بشری بیگم (ش ب ب) رب نواز مائل، ہاشم بابر، ڈاکٹر امین الحق امین اور طاہر آفریدی کی تخلیقات میں ترقی پسند رویوں کی نشاندہی کی ہے۔

سلیم راز صاحب کی ایک اور کتاب "لہ بارہ تر بارہ کلی" (رپورتاژ) میں بھی ترقی پسند تنقید کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

پشتو کے دیگر ناقدین میں سے ڈاکٹر اسرار، ڈاکٹر شیر زمان طائزی، ڈاکٹر سہیل انشاء، ڈاکٹر یار محمد مغموم، صاحب شاہ صابر، نور الامین سٹوری، ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار وغیرہ کی تنقید میں ترقی پسند رویوں کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ سینئر ناقدین میں سے دوست محمد کامل، ولی محمد طوفان، اجمل خٹک، میر مہدی شاہ مہدی، لطیف وہمی، سعادت خان جلیل، سیف الرحمن سلیم وغیرہ کی تحریروں میں ترقی پسند تنقیدی افکار کی تشریح اور توضیح مختلف موقعوں پر کی گئی ہے۔

یوں پشتو تنقید کا غالب ترین رجحان ترقی پسند رویوں کی ترجمانی اور ترقی پسند افکار کی توضیح رہا ہے جو تا حال جاری ہے۔

محقق وقار محمد داؤد وفا نے قیام پاکستان کے بعد پشتو کے ناقدین اور تنقیدی ادب میں متعلقہ کتب کی ایک فہرست اپنی کتاب پشتو معاصر تاریخ میں دی ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر نواز طاہر، ایاز داؤد زی، سلیم راز، ڈاکٹر اسرار، صاحب شاہ صابر، راج ولی شاہ خٹک، اقبال نسیم خٹک، سعید گوہر، عبد الرحیم مجذوب، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، محمد اصف صمیم، زرین انخور، عبد الرووف رفیقی، داور خان داود، یار محمد

مغموم، سلمی شاهین، ڈاکٹر سهیل انشا، اسیر منگل، ڈاکٹر لطیف بهاند، گل افضل ټیکور، عبید الله محک، پروفیسر ڈاکٹر خالق رشید، سر محقق نور محمد سهیم، احمد جان مروت اظهار الله اظهار، ڈاکٹر زبیر حسرت، ڈاکٹر لیاقت تابان، عصمت الله زهیر، محمود ظفر (۹۲)

تنقید سے متعلق کتب کی تفصیل انھوں نے یوں فراہم کی ہے۔

پټه خزانه فی المیزان: قلندر مومند ۱۹۸۹م/ پیښور
دافغانستان اوسني ادبیات (د سیمینار د مقالو مجموعه): بیلا بیل لیکوال، ۱۹۹۰م/ پیښور
تخلیق او تنقید: افضل رضا (دویم چاپ)، ۱۹۹۰م/ پیښور
دپټې خزانې، میزان ربښتیا میزان دی؟ محمد آصف صمیم، زرین انځور، ۱۹۹۰م/ پیښور
ذکره کتنې دولونه: سر محقق زلمی هیوادمل، ۱۹۹۱م/ کابل
تول پارسنګ (دپټه خزانه فی المیزان په ځواب کې) (دوه ټوکه): همیش خلیل ۱۹۹۶م/ پیښور
پوخ کاڼی: محمد معصوم هوتک، ۱۹۹۶م، تیو رنیبو- کاناډا
هذا کا کنزتم (دپټې خزانې په باب پر کره کتنو کره کتنه): مشتاق مجروح یوسفزی، ۱۹۹۸م/ پیښور
په تله کې پارسنګ: محمود ظفر ۱۹۹۸م/ پیښور
پټه خزان فی الحقیقت: سعید ګوهر، ۱۹۹۸م/ کوټه
حقیقت دادی: همیش خلیل ۱۹۹۹م/ پیښور
منشور- کره کتنه: مصطفی سالک ۲۰۰۰م/ پیښور
پښتو ناول تحقیقی او تنقیدی جائزه: حنیف خلیل، ۲۰۰۰م/ پیښور
د ادبی کره کتنې تاریخی پس منظر او معیارونه: کاندید اکادمیسن سر

محقق محمد صدیق روهي / ۲۰۰۱م/ پېښور

کره کتنه : ډاکټر منظور / ارج الدين اقبال (ژباړن) ۲۰۰۲م/ پېښور

تنقیدی کرښې : سلیم راز؟ پېښور

زانه فکرونه (ارواني) کره کتنه) : حنیف خلیل، ۲۰۰۳م/ پېښور

حیرانه او کره کتنه: پروفیسر داور خان داود، ۲۰۰۳م/ پېښور

غوره کتنه او نوی کتنه (کره کتنه): پوهاند صدیق الله رښتین، ۲۰۰۳م، پېښور

تنقید : عبد سن / قلندر مومند (دوريم چاپ) ۲۰۰۹م/ پېښور

ادب او ادبي کره کتنه: عبد المالک همت۲۰۰۲م/ کوټه

ادبي تنقید : ډاکټر عارف تسیم ۲۰۰۸م/ پېښور

پښتو ادب تاریخ (کره کتنه): عبد القیوم مشوني ۲۰۱۰م/ جلال آباد

تنقیدی ادب (MA کورس کتاب): ډاکټر حنیف خلیل، ۲۰۱۱م/ کوټه

تنقید په پښتو ادب کې : ډاکټر حنیف خلیل ۲۰۱۱م/ جلال آباد

تنقیدی فیصلې : فیصل فاران ۲۰۱۲م/ کوټه

ادبي کره تکنه : پوهاند فیض محمد فیاض،۲۰۱۲م/ جلال آباد

دپښتو ادبیاتو ده کره کتنې لنډه تاریخچه : عبد الخالق رشید، ۲۰۱۵م/ جلال

دپښتو شاعرۍ په وده کې د تنقید کردار: ډاکټر صاحب شاه صابر، ۲۰۱۵م/ پېښور

ادبي کره کتنه: محمد ابراهیم همکار،۲۰۱۶م/ جلال آباد

ادب او تنقید ی مسایل: سلیم راز،۲۰۱۶م/ جلال اباد

دورکې لاری مساپر: سباوون مومند ۲۰۱۶م/ پېښور

ساهو ادب (تحقیق او تنقید یوه جایزه): مشتاق مجروح یوسفزی، ۲۰۱۶م/ پېښور

خیړنه او تنقید : نعل بادشه خیالی ، ۲۰۱۸ م / پېښور (۹۳)

ہمارے عصر کے نقاد و محقق فیض الوہاب فیض نے پشتو میں جدید تنقید سے متعلق چند بنیادی نکات کی نشان دہی کی ہے اُن کے بیان کردہ نکات اس طرح ہیں۔ اس پس منظر کی روشنی میں اگر ہم عصر رواں تک پشتو تنقید میں نئے رجحانات کی نشان دہی کرنا چاہیں تو مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ایک فہرست مرتب کر سکتے ہیں:

- ادب کے ذریعے معاشرے کی اصلاح اور ذہنی بیداری کا کام لینا۔
- ادب کو ایک نیا مزاحمتی لہجہ دینا۔
- ادب میں مقصدیت پر زور دینا اور اسے خاص مقاصد کے لئے استعمال کرنا۔
- ادبی تنقید میں دوسرے علوم سے استفادہ کرنا۔
- عالمی ادب اور عالمی تحریکوں سے آگاہی حاصل کرنا اور ذہنی آفاق کو وسیع کرنا۔
- نئے نئے تجربات کرنا اور ان کو قبولیت سے ہمکنار کرنا۔

طبقاتی کشمکش میں ادب کو بطور ہتھیار استعمال کرنا اور پسے اور کچلے ہوئے طبقے کے حالات اور خیالات کی ترجمانی کرنا۔

- انگریزی رومانیت سے متاثر ہونا اور پشتو میں جدید رومانوی شاعری کی ابتداء کرنا اور تنقید کرنا
- نئے نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ نئی قسمیں اور اصناف اپنانا۔
- روایتی تنقیدی نظریات کے بارے میں مربوط انداز میں کتابیں لکھنا۔
- ادبی تنظیموں کے پلیٹ فارم سے مجلسی اور علمی تنقید کو رواج دینا۔
- مغربی تنقیدی مقالات اور کتب کے تراجم کرنا۔
- مشرقی تصوف میں مغربی رومانوی فلسفے کی پیوندکاری کرنا۔
- پختون قومیت اور قومی وحدت کا تصور واضح کرنا۔
- قدیم ادب کے بارے میں جدید سائنسی انداز میں تحقیق کرنا۔
- اجتماعی اسلوب ادب کی جگہ انفرادی اسلوب ادب کی پذیرائی کرنا۔
- پشتو فوک ادب پر وسیع پیمانے پر کام کرنا۔
- پشتو کی لسانی تشکیلات کے بارے میں جدید لسانیاتی سائنس کی روشنی میں کام کرنا۔

- جدید علوم کو پشتو میں منتقل کرنا۔
- پشتو زبان و ادب اور ثقافت کے بارے میں مذاکروں، سیمینارز اور کانفرنسوں کا انعقاد کرنا۔
- مذہبی نقطۂ نظر سے پشتو ادب پر نظر ڈالنا۔ اس سلسلے میں قرآنی تنقید کی اصطلاح درمیان میں لانا جو قرآن پاک کے اصول اور قوانین کی رو سے دوسرے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ ادب کے بارے میں بھی ایک نقطۂ نظر پیش کرتا ہو(۹۳)

اس پس منظر میں ہم پشتو تنقید کے خد و خال کو مد نظر رکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ تنقید کے یہ جدید پہلو پشتو میں قیام پاکستان کے بعد ہی عام ہوئے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد پشتو کے جدید تنقیدی تناظر پر مغرب کے انگریزی ادب کے بھی اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اس دوران اردو تنقید سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ روسی، جرمنی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں کے عالمی ادب سے تنقیدی افکار پشتو میں داخل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد پشتو تنقید کو ہم عالمی منظرنامہ کے ساتھ ملا کر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

☆☆☆

نظم نگاری

نظم کی قدیم شکلیں پشتو میں عرصہ قدیم سے مروج ہیں بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پشتو منظوم ادب کی معلوم تاریخ کے مطابق پشتو کا پہلا شاعر امیر کروڑ نظم کا شاعر تھا اور یوں پشتو میں نظم نگاری کا یہ سفر ۱۳۹ھ سے شروع ہو کر مسلسل جاری رہا۔ کلاسیکی دور میں روشنیہ تحریک سے وابستہ شعراء نے نظم کی مروجہ ہیئتوں میں اظہار خیال کیا۔ خوشحال خان خٹک، رحمان بابا اور دیگر کلاسیکی شعراء نے نظم کی قدیم ہیئتوں میں شاعری کی۔ قصائد، مرثیے، رباعیات، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، اور دیگر قدیم شکلوں میں نظم نگاری کے کئی نمونے دستیاب ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھی نظم نگاری کا یہ تسلسل جاری رہا۔ یوں نظم کی قدیم شکلوں کے ساتھ ساتھ کئی جدید شکلیں بھی پشتو کے منظوم ادب میں مروج ہو گئیں۔ نظم کی جدید شکلوں میں ہمیں فنی تجربے بھی نظر آتے ہیں اور عالمی ادب کے منظر نامے میں جدید رجحانات و میلانات کا عکس بھی جھلکتا ہے۔

اس طرح بعد میں جب امیر حمزہ شنواری، غنی خان، سمندر خان سمندر، دوست محمد کامل، پشتو میں نظم لکھنے لگے تو نظم کے معیار، مقدار دونوں میں خاصا اضافہ ہوا اور جب حالی اور خصوصی طور پر اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے والے جدید فکر و آہنگ کے نمائندہ شعراء سید رسول رسا، فضل حق شیدا، اشرف مفتون، یونس خلیل، عبدالرحیم مجذوب وغیرہ نے پشتو میں نظمیں لکھیں تو پشتو نظم جدید تر اسلوب و افکار کی نمائندہ ہونے لگی۔ دوسری جانب مقصدیت کے علمبرداروں میں ولی محمد طوفان، اجمل خٹک، ایوب صابر، قلندر مومند، ہمیش خلیل، میر خلیل، میر مہدی شاہ مہدی، قمر راہی، سلیم راز وغیرہ نے پشتو جدید نظم میں اپنے انداز فکر سے اضافے کیے۔ افغانستان کے شعراء میں گل پاچا الفت، قیام الدین خادم، سلیمان لائق، عبدالباری جہانی، محمد صدیق پسرلے، حبیب اللہ رفیع وغیرہ نے جدید نظم کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ہاشم بابر، رب نواز مائل، امین اللہ امین، درویش درانی، ڈاکٹر امین الحق مرحوم، ناظر شنواری، اکرم فاروق شنواری، نوشاد علی خان باتو اور سیدہ حسینہ گل نے انفرادی اسلوب میں نظمیں لکھیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری و ساری ہے یہاں تک کہ آج کے جوان شعراء میں الطاف خٹک، محمد
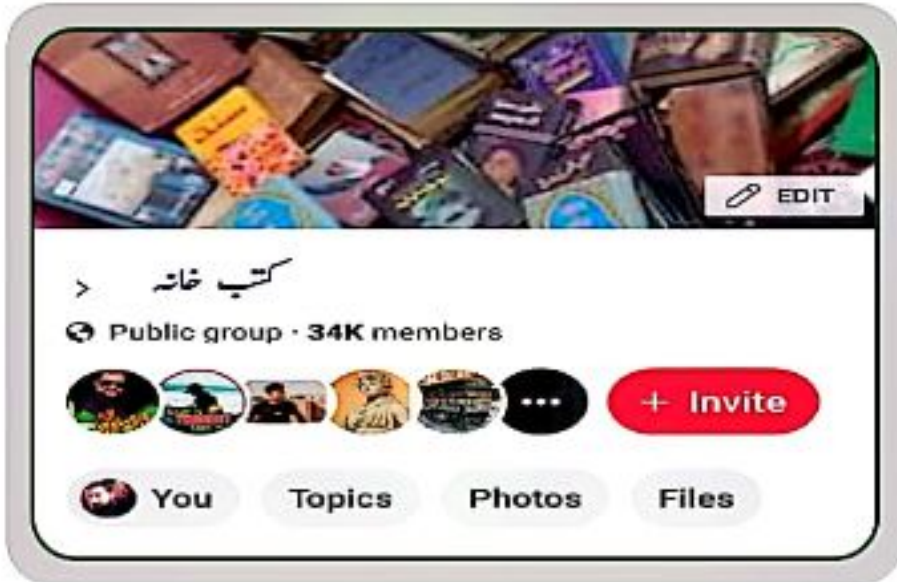
سعید سعید، حسین محمد صدق، ایاسین یوسفزئی، دوست محمد دوست، گرگری، شوکت حسین حسرت، احمد جان مروت، اور چند دیگر اس سلسلے میں مصروف عمل ہیں اور پشتو جدید نظم کی جھولی کو قیمتی موتیوں سے مالا مال کر رہے ہیں۔ دیگر نوجوان شعراء میں افضل شوق، تسیم اچکزے، کامران اچکزے، علی کمیل، خلیل باور، عبدالرؤف رفیقی، شفیق الحالم، معتبر دیدہ ور، فیض محمد شیزاد، طارق محمود دانش، عنایت اللہ ضیا، شہاب خوچے، ریاض تسنیم اور کئی دیگر شامل ہیں۔

آزاد نظم

پشتو میں آزاد نظم کی روایت کی پاسداری بھی شدومد سے کی گئی ہے۔ پہلی آزاد نظم لکھنے کے دعویدار کئی لوگ ہیں جن میں سید رسول رسا، لطیف وہمی، مراد شنواری اور ایوب صابر کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن ایڈورڈز کالج پشاور کے مجلے "تجلی" کی سند پر پشتو کی پہلی آزاد نظم ارباب ہدایت اللہ نے "ہوگئی" (چاند) کے عنوان سے لکھی ہے جو سالنامہ تجلی کے 1941-42ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے(۵۵)

پشتو میں آزاد نظم کو بہت مخالفت اور طویل مباحث کے بعد قبولیت کی سند حاصل ہوئی ہے۔ ایک طبقہ شاعری کے مشرقی مزاج اور تکنیکی اہمیت کے حوالوں پر زیادہ زور دیتا تھا جیسے امیر حمزہ شنواری بابا، سمندر خان سمندر، عقاب خٹک وغیرہ، اس طبقہ نے آزاد نظم کی بھرپور مخالفت کی اور اس کو شاعری میں تکنیک اور چابک دستی سے فرار کا نتیجہ قرار دیا۔ دوسرا طبقہ مشرقی اقدار اور جدید اصناف کا حامی تھا اور شاعری میں لفظی تکنیک، صنائع اور تلازمات سے زیادہ فکری جدت اور ابلاغ کے موثر ہونے پر زور دیتا تھا۔ اس طبقہ میں سید رسول رسا، ایوب صابر، مراد شنواری وغیرہ کے نام ہمارے سامنے ہیں۔ ان دونوں طبقہ ہائے فکر میں تحریری مباحث ہوئے ہیں لیکن مخالفت و تنازعات کے باوجود پشتو میں آزاد نظم نے خوب ترقی کی۔ مذکورہ مدافعین کے علاوہ قلندر مومند، طاہر، عبدالرحیم مجذوب، یونس خلیل، سلیم راز، امین اللہ داؤدزی، ایاز داؤدزی، ڈاکٹر مجاور احمد زیار، پیر محمد کاروان، قوزیا انجم، سلمیٰ شاہین، سید وحید گل، ہدایت اللہ نعیم حتیٰ کہ آزاد نظم کی مخالفت کرنے والے امیر حمزہ شنواری بابا نے بھی آزاد نظم کہی۔ حمزہ بابا نے اپنی پوری زندگی میں ایک ہی آزاد نظم لکھی ہے۔ نظم یہ ہے۔

(دکیمیا بوٹے)

داد غرو نو پخی شنې او موسکی مورګی
داسی بنګاری
لکه دلته جنتو نو کړی مسته غزونی
اوقدرت وی خپلی واړه تازګی دلته شیندلی
د اضد ادو پر دبل د تعاقب نه
انګازه د ژوند پیداوی
دلته و نی جړی بوټی د حکمت سندری وائی
په رونو نو او لختو کښی ئی بهیری جنتونه
ورته اوچی شنډی سیمی
وی دمینی عیک پرانستی
چی دا سا په په ژورو د ضمیر کښی
رنګ په رنګه رنګینی دژوندانه په خوسکیدو شی
میدانونه ګلستان شی
دکیمیا بوټی په سمو زرغونه شی
خو دا پوعه چی پری راشی
کړی پامال نے د پښتو لاندی
داسی زه په پښتو نخوا کښی(۹۹)

ترجمہ:

کیمیا کا پودا

یہ ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے پہاڑوں کے دامن یوں نظر آتے ہیں جیسے جنتوں نے ادھر انگڑائی لی ہو۔ جیسے قدرت نے اپنی تمام تر تازگی و رنگینی ادھر ہی بکھیری ہو۔ متضاد ین کے ایک دوسرے کے تعاقب ہی سے زندگی جنم لیتی ہے۔ یہیں پل بوٹے اور جڑی بوٹیاں حکمت کے گیت گاتی ہیں۔ یہاں کی ندیوں میں جنتیں بہتی نظر آتی ہیں۔ بنجر علاقوں نے بھی محبت کے لئے گود کھلی رکھی ہے۔ اچانک

ضمیر کی گہری وادیوں میں زندگی کی رنگینیاں مہک اٹھتی ہیں۔ میدان گلستان بن جاتے ہیں کیمیا کے پودے اگ جاتے ہیں مگر ناتمام لوگ آ کر انہیں پیروں کے روند ڈالتے ہیں۔ پشتو نثر میں معریٰ حیثیت بھی یہی ہے۔

معریٰ نظم

جدید اصناف کو خیر مقدم کہتے ہوئے پشتو ادب نے مغربی ادب کے Blank Verse کو معریٰ نظم کی شکل میں خوش آمدید کہا۔ عموماً ان شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کی جنہوں نے انگریزی اور مغربی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ چونکہ مغربی اور خصوصاً انگریزی ادب میں شاعری زیادہ تر آزاد نظم (Free verse) اور معریٰ نظم (Blank verse) میں ہوتی ہے اور ہماری مشرقی شاعری کی طرح دیگر منظوم اصناف ان کے ہاں بہت کم ملتی ہیں اور جو ملتی ہیں وہ بھی مشرقی ادب سے مستعار ہیں اس لئے انہوں نے شاعری کی اصطلاح کہنے والے کے لئے وضع کی ہے جو فرانسیسی کی Poem سے ماخوذ ہے اور پھر نظم Poem کو دو بڑی اقسام آزاد اور معریٰ نظم میں تقسیم کیا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پشتو میں معریٰ نظم بھی آزاد نظم کی طرح مغرب اور خصوصاً انگریزی ادب سے آئی ہے۔

ابتدائی دور میں معریٰ نظمیں عموماً ان شعراء نے لکھیں جو اسلامیہ کالج پشاور کی ادبی روایت سے منسلک تھے یہ وہی دور ہے جس میں آزاد نظم کا تعارف پشتو میں ہونے لگا تھا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پشتو میں آزاد نظم اور معریٰ نظم نے ایک ہی دور میں سفر کیا ہے اور تقریباً ان ہی شعراء نے معریٰ نظم لکھی ہے جنہوں نے آزاد نظم لکھی تھی۔ بلکہ کافی عرصہ تک تو آزاد نظم اور معریٰ نظم کو ایک ہی صنف سمجھتے ہوئے معریٰ نظم کو بھی آزاد نظم کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہ واضح ہوا کہ معریٰ نظم محض قافیہ سے عاری ہوتی ہے۔ وزن میں تمام مصرعوں کی برابری کی پابندی اس میں ہوتی ہے جبکہ آزاد نظم، قافیہ ردیف، وزن اور تمام پابندیوں سے آزاد ہوتی ہے۔ صرف اور صرف مصرعوں کی غنائیت اور ترنم شرط ہے اس لیے کہ غنائیت کے بغیر نظم، نظم نہیں ہوتی نثر ہوتی ہے۔

پشتو میں اشرف مفتون، سید رسول رسا، فضل حق شیدا اور یونس خلیل نے ابتدائی دور میں معریٰ نظم میں طبع آزمائی کی تھی۔ ان سب شعراء سے عمر میں زیادہ بزرگ شاعر کاکا جی صنوبر حسین مومند نے بھی معریٰ نظم میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی نظم کا دور معلوم نہیں ہے۔ اس لیے کہ کاکا جی صنوبر کلی طور پر ادب

کی طرف تب مائل ہو چکے تھے جب وہ پاکستان کی آزادی کے بعد علاقہ غیر سے پشاور آ گئے تھے۔ اس لیے ہم پشتو میں سب سے پہلے معریٰ نظم کس نے لکھی ہے یہ واضح نہیں۔ اتنا واضح ہے کہ ان تمام شعراء میں سب سے پہلے یونس خلیل مرحوم کا شعری مجموعہ "لالہ زار" 1946ء میں چھپا۔ یونس خلیل مرحوم نے اس سے پہلے دور 1943ء کی لکھی ہوئی ایک معریٰ نظم مجھے دکھائی تھی جو اب ان کی ناچاپ شاعری میں محفوظ ہے۔ اس لحاظ سے فی الحال ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ پشتو میں معریٰ نظم کا پہلا نمونہ یونس خلیل مرحوم کے ہاں پایا جاتا ہے۔ بعد میں عبدالرحیم مجذوب، لطیف وہمی، ایوب صابر، مراد شنواری، اجمل خٹک، سلیم راز، امین اللہ داؤدزئی، ایاز داؤدزئی، قمر راہی، فوزیہ انجم، سلمیٰ شاہین اور حسینہ گل وغیرہ نے بھی معریٰ نظمیں لکھیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے اور پشتو میں اچھے معیار کی معریٰ نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔

سانیٹ

سانیٹ معریٰ نظم کی وہ شکل ہے جس کے ایک بند میں یا مکمل نظم میں چودہ مصرعے ہوتے ہیں اور مصرعے تمام کے تمام معریٰ نظم کی طرح ایک بحر اور وزن میں ہوتے ہیں۔

پشتو میں پہلے سانیٹ کا نمونہ بھی یونس خلیل مرحوم کے ناچاپ کلام میں محفوظ ہے جو لگ بھگ اسی زمانے کا ہے جس زمانے میں معریٰ نظم لکھی تھی لیکن پشتو کے تحریری ادب میں اس کے نمونے بہت کم ملتے ہیں۔ اشرف مفتون، ہاشم بابا اور عبدالرحیم مجذوب نے اس طرف بھی توجہ دی ہے۔ انگریزی کے رومانی شاعر اور معریٰ نظم کے نمائندہ فطرت نگار ورڈز ورتھ (wordsworth) کی مشہور نظم دی سالٹری ریپر (the Solitary Reaper) کا ترجمہ اور تاثر، میں نے پشتو میں سانیٹ کی شکل میں منظوم کیا تھا، اس کا پہلا بند پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

ملگرو غوږ شئ ورته	عفه د غرو تو جیني
حالتله پڅو کنئي اخته	لو کڅی سندره واني
په خیل سرور کنبي مسته	خبر له خانه نه ده
ملگرو رو تیری یږی	چی چرته پوطه نه شی
دغه له دږده ډکه	سندره غوری غواړی

کا تعین سیلا بوں (Sylables or Meters) پر کیا جاتا ہے۔ ہائیکو اصل میں جاپانی صنف ہے لیکن انگریزی اور پشتو میں بھی لکھی جا رہی ہے۔ انگریزی اور پشتو کا ذکر بطور خاص اس لیے کیا جا رہا ہے کہ ان تینوں زبانوں میں بحور کا تعین ایک طرح سے ہوتا ہے اور دیگر مشرقی زبانوں جیسے فارسی، اردو، سندھی، پنجابی، سرائیکی وغیرہ میں وہی عروضی نظام مروج ہے جو عربی زبان سے ان زبانوں میں در آیا ہے۔ جاپانی صنف ہائیکو کی اصل بحر پانچ، سات، پانچ سیلابوں کے تین مصرعے ہوتے ہیں۔

پشتو میں قاسم محمود (پہلے قاسم ہوتی تھے) کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے پشتو میں ہائیکو لکھی ہیں جو خالص جاپانی بحر میں ہیں۔ اسماعیل گوہر نے ہائیکو کا پہلا مجموعہ "سکا" (مسکان) کے نام سے شائع کیا ہے لیکن ہائیکو کی صنف پر زیادہ توجہ کے ساتھ اظہر اللہ اظہار نے کام کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف سب سے زیادہ ہائیکو کے مجموعے شائع کیے بلکہ ہائیکو کے فن پر پشتو میں مباحث کے دروازے بھی کھول دیے ہیں۔ اظہار کے مجموعوں کے نام یہ ہیں۔

1 راته غوګوته کښې بنګړي شرنګوي
(میرے کانوں میں چوڑیوں کی جھنکار پڑ رہی ہے)

2 ګالرې د ګل په لاس کښې خوندنه کوي
(پھول سے چہرے کے ہاتھوں میں پتھر اٹھانا زیب نہیں دیتا)

3 ستا د ځوانۍ تصویر په خوب او ده دے
(تیری جوانی کی تصویر سو رہی ہے)

اظہار نے ہائیکو کے بحر میں تجربے کیے ہیں اور ہائیکو پشتون مزاج سے ہم آہنگ کر کے لکھا ہے۔ اظہار کے علاوہ ہائیکو کے مجموعوں میں قاسم محمود کا "درے مصرعیز نظمونه" (تین مصرعوں کی نظمیں)، ڈاکٹر ریدار یوسفزئی کا "نسکوری لیې" (الٹے اٹھے ہوئے ہاتھ)، نواز طاہر کا "خوبونه په خپل کلي کښې" (خواب اپنے گاؤں میں)، ناہید سحر کا "خپلو خوبو نو له تعبیر لټوم" (اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہی ہوں) شائع ہوئے ہیں۔ محمد ایاز غزال اور شکیل احمد نایاب کے مجموعے غیر مطبوعہ ہیں۔ مذکورہ شعراء کے علاوہ چند اور نوجوان شعراء بھی ہائیکو لکھ رہے ہیں جن میں عامر گریانے، آدم علی، نادم خٹک اور بلوچستان کے شعراء میں رب نواز مائل، سرور سودائی، عمر گل عسکر، تیمور شاہ کمال، کامران ایچکزی اور علی کمیل قزلباش وغیرہ بھی اس صنف میں طبع

آزمائی کر رہے ہیں۔

"پشتو میں انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی، سندھی، بلوچی اور پنجابی زبانوں سے تراجم بھی ہوئے ہیں جن کے نمونے اظہار اللہ اظہار نے اپنے مجموعے" ستا د خوانی ، تصویر پہ خوب او وہ دے"(۹۸)

ہائیکو کے ان مترجمین میں اظہار اللہ اظہار کے علاوہ عطیہ جلیل (عربی سے ترجمہ) اقبال حیدر (سندھی سے ترجمہ)، ڈاکٹر علی دوست بلوچ اور پروفیسر غنی پرواز (بلوچی سے ترجمہ) کے نام شامل ہیں۔

پشتو ہائیکو کے موضوعات متنوع ہیں۔ اگر چہ جاپانی ہائیکو کے موجد باشو" نے فطرت نگاری کے موضوع کو ہائیکو کے لئے زیادہ مناسب سمجھا ہے لیکن" باشو" کے عصر میں" مسا" اور" کاشیکی" نے ہائیکو کے لئے انکشاف ذات، داخلیت اور شخصی انفرادیت کا موضوع زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ اسی طرح جاپانی میں شکی سرتو کا، یاما گوچی، اسا اور یوسو وغیرہ نے جو ہائیکو کہی ہیں ان میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ پشتو کے ہائیکو نگاروں نے بھی پہلے تو فطرت نگاری کو زیادہ تر ہائیکو کا محور بنایا تھا جیسا کہ اظہار اللہ اظہار کے کچھ مجموعوں اور داور کمال کوہر کے مجموعے میں نظر آتا ہے لیکن بعد کے لکھنے والوں خصوصاً اظہار اللہ اظہار نے پشتو ہائیکو میں محور کے تنوع کے ساتھ ساتھ موضوعات میں تنوع بھی پیدا کیا۔

سینتریو

سینتریو کی صنف پشتو میں بالکل نو وارد ہے۔ اب تک پشتو میں صرف ظفر خان ظفری کا نام خصوصی طور پر لیا جا سکتا ہے چونکہ ہائیکو اور سینتریو میں صرف موضوعاتی حوالے سے طنز و مزاح کا فرق ہے یعنی ہائیکو میں طنز و مزاح نہیں ہوتا بلکہ سنجیدہ موضوعات ہوتے ہیں اور جب طنز و مزاح کو ہائیکو کا موضوع بنایا جاتا ہے تو سینتریو بن جاتا ہے۔ اگر چہ پشتو کے ہائیکو نگاروں میں کہیں کہیں سینتریو کا رنگ بھی پایا جاتا ہے لیکن خصوصی طور پر ظفر خان ظفر نے بہت ہی منفرد انداز میں پشتو میں سینتریو لکھے ہیں اور اپنا مجموعہ" دناوی لمور "(دلہن کی بیٹی) کے نام سے شائع کیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

قیام پاکستان کے بعد جب پشتو نظم کا مطالعہ جدید رجحانات و میلانات کے تناظر میں کیا جاتا ہے تو غالب رجحان مقصدیت اور ترقی پسندی کا نظر آتا ہے اور ساتھ ہی رومانوی تاثر کی نمائندہ نظمیں بھی

وافر مقدار میں لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم زیادہ توجہ مقصدیت کی ترجمان اور ترقی پسند تصورات کی نمائندہ نظموں پر دے سکتے ہیں۔ کیونکہ قیام پاکستان کے بڑے اور نمائندہ شعراء ترقی پسند ہی تھے۔ اپنی کتاب پشتو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات سے ان شعراء کی نظم نگاری پر تبصرے کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

اجمل خٹک نمائندہ ترقی پسند پشتون شاعر بھی اپنی نظم "دشاعر احساس ته" (شاعرانہ احساس کو مخاطب) میں کہتے ہیں۔

اے د غریب شاعر د زړه په وینو بل چراغه!
که خیر دی نه به مو دستوره چراغان نے صبل!
د پښتنو د حریت په تندر سوری داغه!
که خیر وی نه به پلوشے د کهکشان نے صبا!

ترجمہ:

اے غریب و مفلس شاعر کے خون جگر سے روشن چراغ! انشاءاللہ تو ہی ہمارے آنے والے کل کے لئے روشن ستاروں کا کہکشاں ہوگا۔ اے پشتونوں کے ماتھے پر جلے ہوئے کالے داغ کے نشان! تو ہی ہمارے آنے والے کل کے لئے کہکشاں کی کرنیں بکھیرنے کا سبب بنے گا۔

اس قسم کے شاعرانہ مخاطبے کے لئے ماسی جشت گری نے بہت ہی خوبصورت نظم لکھی ہے جو ترقی پسند شاعر کے لئے منشور کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کا عنوان ہے "تجویز" (تجویز) اس نظم میں شاعر پہلے تو پشتون شعراء کو اپنی عظمت رفتہ کی یاد دلاتا ہے اور پھر ایک تجویز پیش کرتا ہے کہ آؤ ہم گل و لب و رخسار کے تذکرے شاعری کا حصہ بنانا چھوڑ دیں اور ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھا کر مظلوم و محکوم طبقے کی داد رسی کے لئے شعوری بیداری پیدا کریں۔ دنیا میں ہر جابر حکمران کا مقابلہ کریں اور علمی سطح پر محکوم طبقے کے حقوق کا پیغام دیں۔ چونکہ یہ نظم مجموعی لحاظ سے ترقی پسند شاعر و دانشور کے لئے ایک دستور العمل درجہ رکھتی ہے لہذا مکمل نظم قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

تجویز

دپښتنو د سر حد و نو ننګیا لاتو!
داولس په غم ککړو شاع راتو!

دقام ستر کو د خیالو نو شهزاد گانو!
غیرت مندو تورزنانو! پاتو رانو!
په پنجره کینې وزر ماتو شنه طوطیانو!
دبنګلا دجنتونو سیلانیانو!
په سرو شونډو میننانو غزلخوانو!
په دار شو و داور دو اور دو زلفانو
دخوشحال دنغرې سر کو بخرو!
دایمل دتیرې تورې وار ثانو!
ددریا د غیرتي ویښو سرو خاڅکو!
حق غور بنتونکو د خوارانو مزدورانو!
داتسبان د آبادۍ په مینه مستو!
داولس دسوکالۍ په مینه مستو!
په هروخت کنبې دسیر لوطمع لرونکو
دچمن د بترازۍ په مینه مستو!
که دخلې پر انستو حق دلته لرمه
ستا سو مخکښې یو تجویز دې پشکومه
حتی چه رونډ له غاره ور کړو غزل پریږدو
حتی چه شونډې ستر کې پریږدو اوربل پریږدو
حتی چه واره سو ده مینه شو خلوص شو
حتی چه خپلو کنبې دا جنګ و جدل پریږدو
حتی چه یو شو چه غم یو بنادی یوه کړو
حتی چه پاسوانو خبر تېه تېه کړو
حتی چه اوشلور تیرې دظلمتو نو
حتی چه لاره دمنزل حانته رنړه کړو

خوبه موتزه ډیر بل په غو بنو پایو
خو به مونږه د غرض غرض قیصه کړو
تر خو مونږه به یو بل په کانړو اولو
حئی چه مورا وروروئی حپله خوره کړو
حوی چه غنشود خیبر دا تاثرے نه
حئی چه داچغه په تول جهان خوره کړو
حئی چه "خان" نه دخوار اتو بدل و اخلو
دمظلوم له ظالمانو بدل و اخلو
چه حسونره ه غریبه ازار آخلی
حئی له طغے غاصیانو بدل واخلو
حئی چه خپل " سحرتری واخلو نو شہپ ور کړو
حئی چه کادی د ں و ندون له موپیته ور کړو
پاسئی نن ورسره خپل حساب کتاب کړو
حئی چه دے حائے نه بنا یو انقلاب کړو
دامور خت دے کئی خدا نیکو چه ختمیرو
سته خبر شی که رنړانه شوه تنکیرو
حئی چه نن په خپلو وینو جامے سرے کړو
که صباته پاڼے کیږو نو ور کیږو
حئی چه طر غروولہ اور دظلم سور کړو
حئی چه مخکښے شو هله په پاتے کیږو
حئی چه هر دوخت فرعون له لته ور کړو
حوی چه هر دقام قاتل سره جنګیږو!
حئی چه هر جابر له داسے سبق ور کړو
چه په هر تاریخ کښے پاتری نه هیریږو

چه ماښرې ورله همه مقتل مقتل کړو

چه میلمه دغر جارح کړه اجل کړو

چه همه "الجزائر" سلام سلام شی

حتی چه هر ځائے کښے پیدا مو احترام شی

حتی چه مونږ د یے ننګی زنار کړو لرے

حتی چه ژوند مو په سکون شی په آرام شی

حتی په ننګ دویتنا میانو قسم او کړی

دخپل قام په شهید انو قسم او کړی

چه ږوند و ن له زولنو آزاد وبه

داتیرے داستبداد ر نړ آکنووبه

دخوشحال ننګ او غیرت به ځان سره کړو

دایمل نه به دتورے دعل زده کړو

درحمان په ادیره به دعا او کړه

دحمیده بابا غزل به وظیفه کړو

له میرویس به د ملکرو پتے واخلو

ننګیالی د یو سف موبه مرکه کړو

دخیالی او دجیندی اوبه به او څښو

مغل خیلو ته به ځان نشه نشه کړو

دختیک بابا نسے به جندره واخلی

هشنغر کښے به تیاره قافله کړو

اول خلاصه به پښتو له زولنو کړو

په هر ځائے کښے جک بیرغ به د پښتو کړو

په اخلاص به غم زپلی قام ته رسو

نو ملګرو ابیابه خپل مرام ته رسو

ترجمہ:

پشتو کی سرحدوں کے جیالو، عوام کے دکھوں کو محسوس کرنے والو پشتون شاعرو، اے غیر مند دانشورو! اے حسن و جذب اور لب و رخسار کے شیدائیو! اے خوشحال خان خٹک اور ایمل خان کی تلوار کے وارثو، اے دریا خان کے غیور خون کے قطرو اور مزدور و مفلس طبقے کے حقوق کے پاسدارو! انسان کی آبادی سے سرشاری مانگنے والو! اگر مجھے کچھ کہنے کا حق دے سکتے ہو تو آپ کے سامنے ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آؤ ہم تر غزلیں کہنا، لب و رخسار کی ستائش کرنا چھوڑ کر آپس میں خلوص و محبت سے پیش آئیں اور آپس میں جنگ و جدل سے احتراز کریں۔ آؤ کہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر قریہ قریہ میں یہ خبر پھیلائیں کہ اپنے منزل مقصود تک رسائی کے لئے ظلمت و تاریکیوں کی تمام زنجیریں توڑ دیں۔ ہم کب تک ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھائیں گے۔ آؤ کہ خیبر اور تیراہ کی چوٹیوں سے پکار پکار کر صدائیں بلند کریں کہ ہم خان سردار اور ظالم و جابر سے مظلوموں کا بدلہ لیں گے۔ وہ جو ہم غریبوں کی آہ سے نہیں ڈرتے ان سے حساب لیں گے اور یہیں سے ایک انقلاب کا آغاز کریں۔ یہی موقع ہے انقلاب لانے کا، ورنہ خود ہی مٹ جاویں گے۔ آج ہی اپنے خون سے لباس کو رنگ دیں گے ورنہ کل نہیں رہیں گے۔ آؤ کہ ہر فرد و فرعون کے سامنے ڈٹ جائیں اور ہر قاتل و جابر کو سبق سکھائیں اور ان کے محلوں کو مقتل بنائیں تاکہ تاریخ کا حصہ بن جائیں۔

آؤ کہ تمام اجزا کو اسلام بنائیں۔ وحدت نام کے شہدا کو عقیدت کا نذرانہ پیش کریں اور استبداد کی تاریکی کو دور کریں۔ خوشحال کا جلال، ایمل خان کی غیرت، دلاور سر تھے کہ رحمن بابا کے مزار پر دعا مانگیں۔ عبدالحمید کی غزل کا ورد کرتے ہوئے میرویس خان کے سرفیوں کا کھوج لگائیں، یوسف زئی قبیلے کے جوانمردوں کو ساتھ ملائیں۔ خیالی اور جندی دریاؤں کا پانی پی کر مغلوں کے سامنے غیرت و جلال کے نشے میں ڈٹ جائیں گے۔ خٹک بابا کے پوتے جھنڈا اٹھا کر بہشت نگر میں قافلہ بنائیں گے ۔ پہلے پشتو کو زنجیروں سے آزاد کر دیں گے۔ اگر ہم اخلاص کے ساتھ مظلوم قوم کی داد رسی کریں تب ہی منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے۔

اس قسم کا تخاطب ایوب صابر، ولی محمد طوفان، سلیم راز اور چند دیگر شعراء نے بھی کیا ہے جو پشتو میں ترقی پسند شاعری کے لئے ایک بنیادی محرک کا کام کر گیا ہے۔

انقلابی اور مزاحمتی شاعری

پشتو کی ترقی پسند شاعری کا ایک پہلو انقلابی اور مزاحمتی شاعری کا ہے اس قسم کی شاعری میں کچھ تو وہ شعراء پیش پیش تھے جو خان عبدالغفار خان کے خدائی خدمتگار تحریک اور انجمن اصلاح الافاغنہ سے وابستہ تھے اور کچھ وہ شعراء ہیں جو انجمن ترقی پسند مصنفین، انقلاب روس اور دیگر عالمی انقلابات سے متاثر تھے۔ انجمن اصلاح الافاغنہ کے بیشتر شعراء نے انگریز سامراج کے خلاف مزاحمتی انداز اور انقلابی رنگ اپنایا اور اپنی مٹی اور وطن سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ انگریز سامراج اور ہر ظالم و جابر کے خلاف آواز اٹھانا اور آزادی و حریت پسندی کے جذبے کو ابھارنا ان شعراء کے کلام کی نمایاں خصوصیت رہی۔ انگریز حکمرانوں کے ظلم و ستم کو ہدف تنقید بنانے والوں میں کئی ایسے شعراء ہیں جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے پہلے کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عموماً سیاسی اور سماجی جبر کے مختلف واقعات کو شاعری کا حصہ بناتے تھے۔

حاجی محمد امین ان شعراء میں سے ایک ایسے مرد مجاہد تھے جو انگریزوں کے خلاف قلمی اور عملی جہاد کے لیے نبرد آزما رہے۔ وہ ضلع نوشہرہ کے علاقے اکبر پورہ میں خدائی خدمتگاروں کے جلسے پر انگریز سرکار کی طرف سے گولیوں کی بارش کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بیا د ظالم د ظلم نخه اکبر پوره شوله

په سیکینو نو کنبی راکیره بی قصوره شوله

ترجمہ

"ایک بار پھر اکبر پورہ ظالم کے ظلم کا نشانہ بن گیا اور بے قصور سنگینوں کی زد میں آ گیا"۔

اسی طرح عبدالخالق خلیق، عبدالاکبر، خادم محمد اکبر، عبدالمالک اور کئی دیگر خدائی خدمتگاروں نے انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ عبدالخالق خلیق 1927ء کو منعقدہ انجمن اصلاح الافاغنہ کے ایک جلسے میں اپنی نظم سناتے ہوئے کہتے ہیں:

د سرحد صوبه به خم د گلستان شی

که زلمی چری بیه خپل وطن قربان شی

که زلمو داآزادی قدر معلوم کر

خپل وطن به به ور بنکاره لکه زندان شی

په دې ژوند د غلامئ به شي پښیمانه
که حقوق ورته معلوم د کل انسان شي

ترجمہ:

اگر نوجوان اپنے وطن پر نثار ہو جانے کا جذبہ رکھیں تو سرحد کا صوبہ بھی ایک گلستان بن جائے گا اگر نوجوانوں کو آزادی کی نعمت کی قدر معلوم ہوئی تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا وطن ایک زندان کی طرح ہے۔ اگر ان کو تمام انسانیت کے حقوق کا احساس ہو جائے تو غلامی کی زندگی پر پشیمان ہو جائیں گے۔

عبدالمالک فدا کہتے ہیں:

د فدا عبد المالک خاورې ترې ئر کړې
چې د کومې زمکې نوم غلامستان رئ

ترجمہ:

اس سرزمین سے عبدالمالک فدا کی مٹی کو بنا دیں جس کا نام غلامستان رکھا گیا ہے۔

اس قسم کی شاعری میں خان میر ہلالی، میر رحمان غازی، میاں جناب کاکا خیل اور کئی دیگر شعراء کا بڑا حصہ ہے جس کا تفصیلی تذکرہ ڈاکٹر یار محمد مغموم کی کتاب "د آزادۍ تحریک او پښتانه" (تحریک آزادی اور پشتون) میں ملے گا۔

انگریز سامراج کے خلاف اس رد عمل کے علاوہ مجموعی حوالے سے حریت پسندی، مزاحمت اور انقلاب کی شاعری میں اجمل خٹک، ولی محمد طوفان، بخش خلیل، قلندر مومند، قمر راہی، قمر زمان ہوتی، دل، ماصی بہشت نگری، ایوب صابر، سلیم راز وغیرہ نے اپنا فعال کردار ادا کیا ہے۔

اجمل خٹک اپنی نظم "زما زلمیه" (میرے نوجوان) میں کہتے ہیں:

زما زلمیه د غیرت او دپښتنو زلمیه
دلوی بابا د کور د ننګ د سرو لمبو زلمیه
دوخت شاهینه دغور ځنګ او د حملو زلمیه
د دور ځوانه دستګر او د مور رچو زلمیه
نظر ومه شي د بابا د ننګ دستار به کیږي

بھرپور غمازی کرتا ہے۔

مزدور و دہقان کی دادرسی

پشتون ترقی پسند شعراء میں ایک طبقہ ایسا ہے جنہوں نے اپنی شاعری میں بطور خاص مزدور، دہقان اور مفلس طبقے کی دادرسی کی ترجمانی کی ہے۔ اسی مقام پر طبقاتی کشمکش کا پہلو اور محنت کش اور غریب عوام استحصال بھی سامنے آتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تنقید بھی۔ ترقی پسند شاعری کے اس پہلو کو عالمی تناظر میں بھی دیکھا گیا ہے اور اردو شاعری میں بھی حتیٰ کہ علامہ اقبال مرحوم نے بھی اپنی نظم خضر راہ میں کہا تھا کہ:

زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ محنت میں ہے کیسا خروش

اس کے جواب میں علامہ اقبال خضر کی زبانی فرماتے ہیں:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے	خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر	شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار	انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے	مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور پھر بال جبریل کی ایک نظم "فرشتوں کا گیت" میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو کہا جاتا ہے:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو	کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی	اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یہی احساس اردو کی تمام تر ترقی پسند شاعری میں موجزن ہے۔ اس احساس کی ترجمانی پشتو کی ترقی پسند شاعری میں کی گئی ہے۔ پشتو کے نامور ترقی پسند شاعر و دانشور کاکاجی صنوبر حسین مومند اپنی ایک نظم بعنوان "ناکمل نظم" میں اپنے پشتون دانشور کو مخاطب کر کے سرمایہ دار ظالم کا رویہ اور مظلوم مزدور سے اس کا سلوک واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

چه سره زر کورته یوسی	ماله جنت راکوی

ڈے لاس پہ لاس اخلی ماله مهلت را کوی
ددنه خرنه ڈے پکار هغه دیدار د حورو
خوفقط ماله زیرے دشهادت را کوی

ترجمہ:

ٹورہ جواہر کو سمیٹ لیتا ہے اور مجھے جنت کے تصور سے بہلاتا ہے
یہ ٹورہ تو نقد لیتا ہے مجھے مہلت دے کر ٹال دیتا ہے
گویا سے تو حوران جنت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں لیکن مجھے مرتبہ شہادت کی نوید دیتا ہے

آگے کہتے ہیں:

زه د خپل نس دپاره کوره محنت کودمه
زه مزدوري کومه نه چه زاري کومه
زه جوار کړ خوله یم یاد خپل ورور مسلمان
دل آزادی کومه ستاد غزل په دغه
سوه، مصرعومے قسم دخوار خټک په دغه
خیرے جامومے قسم دخوار غریب په دغه
پاکو خولو مے قسم

ترجمہ:

دیکھو! میں پیٹ پالنے کی خاطر محنت مزدوری کرتا ہوں
کاسہ گدائی ہاتھ میں لئے نہیں پھرتا جواباز نہیں ہوں نہ ابھی نہیں کھیلا
اور اپنے مسلمان بھائی کی دل آزاری بھی نہیں کرتا
دل آزاری بھی نہیں کرتا تمہاری غزل کے پرسوز مصرعوں کی قسم
خستہ جاں خٹک کے پھٹے پرانے لباس کی قسم
مفلس و نادار محنت کشوں کے مقدس پسینے کی قسم
مظلوموں کی آہ و فریاد کی قسم بیوہ بچوں کی قسم
سسکیوں کی قسم پیمانہ صبر لبریز ہو چکا

ان دونوں بندوں میں کاکاجی صنوبر نے اس نظریے کی وضاحت کر دی ہے جو انہوں نے کمیونسٹ نظریات سے متاثر ہو کر پیش کیا تھا۔ کمیونسٹ نظریات سے مراد کسی مذہبی نظریے، عقیدے اور مسلک سے اختلاف نہیں جیسے یہ عمومی طور پر سمجھا جاتا ہے۔ مذہب و عقیدہ الگ چیز اور کمیونسٹ نظریات الگ۔ کمیونزم کسی مذہب یا عقیدے کا نام نہیں بلکہ ایک نظام کا نام ہے جو عموماً اقتصادی لحاظ سے سماجی ناہمواری اور طبقاتی کشمکش سے متعلق ہے۔ کاکاجی صنوبر عقیدہ کے لحاظ سے راسخ العقیدہ سنی مسلمان اور با عمل انسان تھے لیکن اقتصادی نظام کی حیثیت سے آپ کمیونزم سے متاثر تھے"

قمرزمان قمر دیوال مزدورو طلس کے اس استحصال کو ختم کرنے کے لئے انقلاب برپا کرنے کے حق میں ہیں اور کہتے ہیں:

چه نهر په خېټه مور کړی — او بربنډ په جامه پټ کړی
چه یتیم خوشحالی او کړی — او یسیر اسیر چور ټت کړی
چه کونډے مراد پوز کړی — او یتیمے له زوړه غت کړی
چه غمونه په خندا کړی — انقلاب ته ضرورت دے
چه غربت د سره ورک کړی — او غریب له کور آباد کړی
چه فقیر مسکین خوشحال کړی — او مزدور لره زړه بناد کړی
مجبوری چه کډے اور کړی — او خوشحاله هر ناشاد کړی
چه فقیر مسکین راجا کړی — انقلاب ته ضرورت دے
چه غربت او خان بوخله کړی — او امیر او فقیر یو کړی
چه یتیم او عظیم نه وی — او نواب او یسیر یو کړی
چه مزدور او با چا یوشی — او دابناد و دلګیر یو کړی
مساوات چه په دنیا کړی — انقلاب ته ضرورت دے

ترجمہ:

ایک ایسا انقلاب لانے کی اشد ضرورت ہے جس سے بھوکوں کو کھانا مل سکے اور یتیم و یسیر کو اطمینان مل سکے، جس سے بیواؤں کی داد رسی ہو اور مغموم لوگوں کو مسکراہٹ نصیب ہو سکے۔

جس سے غربت کا وجود مٹ جائے اور غریب کا گھر آباد ہو جائے جس سے فقیر، مسکین اور مزدور کے اوقات سنور جائیں۔ مجبوری و بے بسی کی جگہ خوشی و راحت لے سکے۔ ایک ایسے انقلاب کی سخت ضرورت ہے۔

ایسا انقلاب جس سے غریب اور خان کے بیچ تفریق مٹ جائے، جس سے یتیم اور عظیم نواب اور امیر میں فرق ختم ہو جائے۔ مزدور اور بادشاہ ایک جیسے انسان ہو جائیں۔ دنیا میں مساوات کا بول بالا ہو جائے، ایک ایسے انقلاب کی ضرورت ہے۔

سید رسول رسا اگرچہ بنیادی طور پر ایک رومانوی شاعر ہیں مگر "باغی زمیندار" (باغی کسان) کے عنوان سے لکھی ہوئی اپنی نظم میں وہ بھی اسی جذبے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خدائے همنا او ستا خوبیودمے موںږه واړه بندګان یو
ته په څه بانډی مالک شوے موںږه ولے فقیران یو
ته دخدائے دلوئے زمکے، میراث خور شوے موںږ شو اُوری
اوس سجدے موںږ ستا په دردی، چه بیرته بندګان یو
یو خو ظلم دفیرنګ دمے، بل ستا لاس په ونبور ننګ یو
تاسو واړه شرمخان یی موںږے زیبتیول ګداګان یو
دخداوے زمکه ده ظلم تخم درحمت باران دخدائے دے
دمحنت حاصل دستاشی رحم اوکړه مظلومان یو
موںږ دهار غرمو کښے سیځو په یخنی کښے تول کړیږو
ته او ستا اولاد مزے کړی موںږه کډیه هم سوران یو
سر مر ترو په پنبو پنے ابلہ بال او بچ حمو تر نیروی
ستا مو تیر بنګله په خیر شه موںږ دی قتل کړو خواران یو

ترجمہ:

ہم سب اللہ تعالیٰ کے ایک جیسے بندے ہیں پھر آپ کس طرح مالک اور ہم فقیر کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سرزمین کا وارث تو ہی بنا بیٹھا ہے اور ہم فقیر بن گئے۔ ہم اتنے بے بس ہو گئے کہ اب تیرے ہی در پر سجدہ ریزہ ہو گئے۔ ایک طرف فرنگ کا ظلم وزور ہے اور دوسری طرف تمہارے ہاتھ بھی

خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ تم سب بھیڑیے اور ہم بے زبان بھیڑ بکریوں کی طرح ہیں۔ زمین اللہ کی، بیج فضل اللہ کا، بارش اللہ ہی برساتا ہے۔ محنت میں کرتا ہوں اور حاصل تمہارا، ہم مظلوموں پر رحم کرو، ہم شدید گرمی اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں اور تم اپنی اولاد سمیت چین و راحت سے سوتے ہو۔ ہمارے بچے ننگے پاؤں ننگے سر بھوک کے پیاسے رہتے ہیں۔ تمھارے موٹر و بنگلے کی خیر ہو۔ آپ نے تو ہم خوار و مفلس انسانوں کو قتل ہی کر دیا۔

اسلم خان کنالی نے سرمایہ داروں کا یہ دن دیہاڑے چوری سے مشابہ کیا ہے اور کہا ہے:

غلا پیشه شوه د مرو اکثر وطن کښې
او وږي عمر خانې محروم ګرځي در په در

ترجمہ:

ہمارے وطن میں اب مالداروں کا پیشہ چوری بن گیا اور بھوکے پیاسے در در پہ دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔

مزدور و دہقان کے مسائل و طبقاتی ناہمواریوں پر بھی اس قسم کی شاعری میں افغانستان کے شعراء میں عبدالرؤف بے نوا، سلمان لائق اور پاکستان کے شعراء میں قمر راہی، پیر گوہر، اجمل خٹک، قلندر مومند، شیر علی باچا، سردار خان فنا، مراد شنواری، ایوب صابر، ولی محمد طوفان اور کئی دیگر شعراء نے حصہ لیا۔

مظلوم طبقے کا استحصال عالمی سیاسی تناظر میں

پشتون ترقی پسند شعراء نے نہ صرف انگریز سامراج کے مظالم کو ہدف تنقید بنایا ہے اور صرف پشتونوں کی آزادی اور حقوق کی ترجمانی کی ہے بلکہ عالمی سیاسی منظر نامہ کو بھی مد نظر رکھا ہے اور دنیا میں جہاں جہاں مظلوم طبقہ جبر و استحصال کا شکار رہا ہے تو پشتون دانشور نے اس پر لب کشائی کی ہے۔ کچھ اشارے تو پہلے مباحث میں بھی کیے گئے ہیں لیکن یہاں کچھ منظومات کا حوالہ دے کر اسی تناظر میں پشتون شعراء کے افکار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پشتون شاعر نے ویت نام، افغانستان اور دیگر مظلوم ممالک کے حریت پسندوں سے اظہار ہمدردی کے طور پر نظمیں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں صرف چند ہی شعراء کے منظومات کا حوالہ دینے پر اکتفا کروں گا۔

ولی محمد طوفان نے کانگو کے صدر پیٹرس لومبا کی ایک نظم کے تاثر میں وزرہ سحر (افریقہ کے دل کی صبح) کے عنوان سے نظم لکھی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

دغم زپلے افریقے مظلومو
دغلو نحسسنه ترمودو داستبداد پاتے شوی
تاسو لومو کښې یے وسه دصیاد پاتے شوی
استعمار چینو طلسمی غوټے مورچی جوړے کړے
چه ژوند اوروح موپه امان کښې اوسی
خود سپین زحیو ظالمانو بچو
په نورو خلقو یو قیامت راګوز کړه
خکه چه دغه یے خپل حق ګنړلو

ترجمہ:

اے مقہور افریقہ کی مظلوم عوام! آپ ایک عرصے سے استبداد کے تیز داں کا ہدف بنے ہیں۔ آپ بے بسوں کی طرح شکاری کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ استعماری قوتوں نے آپ کو زیر کرنے کے لئے مورچے بنائے ہیں لیکن سفید چہرے والوں نے کالوں کے لئے قیامت کا سماں پیدا کیا ہے اور اسے اپنا حق تسلیم کرتے ہیں:

بیش قلیں آفی ویت نام کے حریت پسندوں کے نام اپنا منظوم پیغام ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

ماته په خپل وطن دیبنونه فرصت نشته دے
چی دخپل نظم په تاریخ کښې ستا سو ذکر کړم
اورم چی تاسو په سرو وینو فیصله لیکی
چی مو وطن دپل له زوره ازاد کړے نه وی
نو ترهغی به هن ترمر که خپل ارام و نه کړی
اے دتو د جنګ د دوز خونو سرولمبو زپلو

د ازادۍ ددې جذبې مو احترام کوومه
ماته په خپل وطن دیبنو نه فرصت نشته دے
چې نخپل نظم په تاریخ کنبې ستا سوذ کړو کړم

ترجمہ:

مجھے اپنے وطن کے حوادث سے فرصت نہیں ملتی تا کہ میں اپنے نظم کی تاریخ میں آپ کا تذکرہ کرسکوں۔ سنا ہے کہ آپ نے سرخ خون سے ایک معاہدہ تحریر کیا ہے کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک وطن عزیز کو غیروں کے شکنجوں سے آزاد نہ کردیں۔

نہایت ہی خلوص و احترام سے آپ کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اے جنگ زدہ وزنی شعلوں کے مارے لوگو آپ کی آزادی کے اس جذبے کو احتراماً سلام پیش کرتا ہوں۔ مجھے اپنے وطن کے حوادث سے فرصت نہیں تا کہ اپنی نظم کی تاریخ میں آپ کا تذکرہ کرسکوں (۹۹)

پشتو نظم میں ترقی پسند تصورات اور رومانوی اثرات کے حوالے سے ڈاکٹر اسمٰعیل گوہر نے بھی مناسب تبصرہ کیا ہے اور قیام پاکستان کے بعد پشتو کے جدید نظم نگاروں کی شاعری سے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

نچلے طبقات میں طبقاتی استحصال کے خلاف یہ بیداری تحریک آزادی کے دوران بھی تھی اور آزادی کے بعد بھی اور طبقاتی استحصال کے خلاف ایسی ہی بیداری اور جذبہ ت رکھنے والے اہل قلم ترقی پسند تحریک کے منشور کو اپنانے میں پیش پیش تھے۔ کمزور اور پسے ہوئے طبقات کے حقوق کا منشور لے کر جب ترقی پسند مصنفین سرحد میں متحرک ہوئے تو اس فکری تحریک کو عصری تقاضا سمجھ کر قبول کیا گیا۔ سرحد میں اس تحریک سے وابستہ تخلیق کار اس عہد کے قد آور شاعر و ادیب تھے۔ معروف سیاسی اور علمی شخصیت کاکا صنوبر حسین اس کے صوبائی صدر تھے اور اجمل خٹک، افضل بنگش اور سلیم راز وغیرہ عملی طور پر اس سے وابستہ ہوئے۔ اس تحریک کے ابتدائی ایام میں جن شعراء نے اس کے اثرات کو قبول کیا ان میں قلندر مومند، ہمیش خلیل، ایوب صابر، ولی محمد طوفان، مراد شنواری اور رب نواز مائل زیادہ نمایاں ہیں۔

ترقی پسند شعراء نے حریت فکر اور جرات اظہار کا مظاہرہ کرتے ہوئے طبقاتی استحصال، جبر سماجی ناانصافیوں، معاشی بدحالی، فرسودہ اور جھوٹی روایات اور توہمات کے خلاف لکھا۔ انہوں نے سماج کے مکروہ چہروں سے پردے اٹھائے اور نری رومانیت کے بجائے محکوم و مقہور طبقات کے حقوق، انسان

دوستی اور زندگی کے حقیقی مسائل کو موضوع سخن بنایا۔ نظم کے یہ موضوعات اور ایسا بے باکانہ لہجہ پشتونوں کے قومی مزاج کے عین مطابق تھا۔ عوام شاعر کو اپنے قریب اور اپنا حقیقی ترجمان تسلیم کرنے لگے۔ شاعری خلاؤں سے اتر کر زمینی حقائق سے آنکھیں چار کرنے لگی۔ مقصدیت نے نظم کو سماجی و معاشرتی اعتبار و وقار بخشا۔ نئے افکار کے آزادانہ اظہار کے لئے آزاد نظم کا خوب برتاؤ کیا اور یوں آزاد نظم اپنے جانشین کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک پراثر اور مقبول صنف کے طور پر ابھری۔ نئے ڈکشن اور مفاہیم کا ایک جہاں تازہ آباد ہو گیا۔ سماجی خوف و دہشت، احساس کمتری اور یاسیت کی جگہ اعتماد، اطمینان قلب و ذہن مساوات اور عزم و ہمت نے لے لی۔ ترقی پسند ہر ظالم و جابر کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ موضوعاتی حوالے سے ترقی پسندوں کا کینوس بہت وسیع ہے وہ کسی خاص علاقے یا خطے کی حد بندیوں سے آزاد، انسانیت کی عظمت کے نغمے گانے لگے۔ ان آوازوں میں سب سے زیادہ توانا اور موثر آواز اجمل خٹک کی ہے:

"حریت فکر اور جرات اظہار کے حوالے سے خوشحال خان خٹک کے بعد آپ کا نام سب سے اہم ہے۔ حریت فکر آپ کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ آپ نے جدید دور میں پشتو شاعری کو معاشرتی اور سیاسی فرائض سے آشنا کیا۔ آپ کے کلام میں جوش، انقلاب اور مزاحمت کا رنگ گہرا ہے۔ جبر و استحصال کو جس سطح پر اور جس شکل میں محسوس کیا فکری سطح پر اس کو رد اور مسترد کیا۔ آپ کی شاعری میں سطحی اضطراب اور اشتعال نہیں، بلکہ فکر میں توانائی اور لہجے میں وقار اور متانت ہے۔ کٹھن حالات میں بھی تلخ حقائق کو پراثر رومانی لہجے میں بیان کرنا آپ کا ایک ایسا منفرد سٹائل ہے جو ایک دبستان کے طور پر ابھرا اور آپ ہی اس دبستان کے سرخیل مانے جاتے ہیں۔ آپ کے انقلابی افکار پسماندہ طبقات کی زندگی کے حقیقی مسائل، مصائب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ انسانی زندگی کے حقیقی مسائل کے گہرے ادراک، ترقی پسند تحریک سے وابستگی، سیاست میں عملی شمولیت اور عالمی ادب کے مطالعے نے اس درد مند تخلیق کار اور سچے اور کھرے سیاستدان کو فکری اور سیاسی ہر دو محاذوں پر انسانی زندگی کو اپنی مثبت قدروں اور رعنائیوں کے ساتھ آگے بڑھانے کے لیے ایسی توانائی عطا کی جو کسی تکان کو کبھی خاطر میں نہیں لائی۔

ان کی مقبول ترین نظم "فریاد" کے دو بند ملاحظہ ہوں:

ترجمہ:

تیری جنت کی نعمتوں پر قرباں　　　میں بھوکوں کو بیاں کر رہا ہوں

ترے دوزخ کے سانپوں سے ہے تو بہ　　　جو اژدر ہیں بغلیں کر رہا ہوں

یہاں تو پیٹ کا دوزخ ہے خالی(۱۰۰)　　　وہاں ایندھن تیری دوزخ کا بننا

یہاں بھی کھا گئے قصاب ہم کو　　　وہاں خوراک بھی سانپوں کا ہونا

سرخرو بھوت سیہ رو ہوئے ہیں　　　شدین کے دین دنیا کر رہے ہیں

دیگر ترقی پسندوں کی طرح گو قلندر مومند بھی شعروادب میں ہیئت اور زبان و بیان سے زیادہ سماجی، سیاسی افکار کو اہمیت دیتے رہے لیکن ان کے ہاں زبان و بیان کی کلاسیکی شیرینی بھی پائی جاتی ہے۔ 1961ء میں نوشہرہ میں حوالات میں نظر بندی کے دوران کسی دوست کی طرف سے گلاب کا تحفہ ملنے پر اپنی نظم "تحفہ" کے آخری بند میں کہتے ہیں:

ترجمہ:

حیران ہوں ترا بھیجا ہوا پھول دیکھ کر　　　یہ مسکرا رہا ہے کہ یہ زہر خند ہے

ہو جاؤں سرخرو میرے گل رو خدا کرے　　　رہتے ہیں جو بیدار ہے یا قید و بند ہے

اس گل کو میں تمہید انقلاب کروں گا　　　یہ عزم ہے، قسم ہے یا اپنی سوگند ہے

ایوب صابر اپنی نظم "روایت" میں خدائے بزرگ و برتر کے حضور غریبوں کا دکھڑا یوں بیان کرتے ہیں:

ترجمہ:

عظیم تر مولا!

جب بھی طوفان کبھی آتا ہے　　　جھونپڑیوں کو اکھاڑ جاتا ہے

جب بھی سیلاب کبھی آتا ہے　　　اس میں مفلس ہی ڈوب جاتا ہے

یہ راج کس کا ہے　　　کون مختار یہاں

سماج کس کا ہے　　　خدائی کس کی ہے

اور دستور یہاں کس کا ہے　　　لوگ جو یوں زبوں حال ہیں تو

قصور کس کا ہے؟

سماجی حقیقت نگاری، ترقی پسندوں کے ہاں ایک توانا تخلیقی رجحان رہا ہے۔ شعرا نے امارت

اور غربت کی انتہاؤں پر نظریں مرکوز کر کے پسے ہوئے طبقات کی سماجی مجبوریوں کے حوالے سے ان کی زندگی کی تلخیوں کو شدت سے محسوس اور بیان کیا ہے۔ سلیم راز اس حوالے سے ترقی پسندوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ شعر و ادب اور تنقید میں نہ صرف ترقی پسند نظریات کو برتتے ہیں بلکہ لمحہ موجود میں علاقائی، قومی اور عالمی حالات و واقعات کو انہی نظریات کی روشنی میں دیکھنے اور تخلیقی فرائض ادا کرنے کے داعی ہیں۔ اپنی نظم "میرا شعر" میں کہتے ہیں:

ترجمہ: یاں عیش ہے چند لوگوں کی
سانس مفلس تو لے نہیں سکتا

سر پر گر بجلیاں بھی ہوں رقصاں
سر کو جنبش بھی دے نہیں سکتا

ہر ایک زیست سے بیزار یہاں
کسی جانب رہِ فرار نہیں

ہر ایک ہی یہاں ہے لب بستہ
دہن پہ اپنے اختیار نہیں

پشتو میں جدید نظم کا یہ سفر تا حال جاری ہے۔ بہت جلد معیاری نظمیں لکھی گئی ہیں اور ساتھ ہی کچھ نوجوان شعراء نے بھی نظم کے اس ارتقاء میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ نوجوان شعراء میں چند نمائندہ نظم نگاروں میں شبیر احمد خلیل، سید شاعر مسعود، طارق محمود دانش، روجو خلیل، اور ان سے کچھ سینئر نظم نگاروں میں محمد سعد، حسین احمد صادق اور کئی دیگر کے نام شامل ہیں۔

☆☆☆

غزل

پشتو میں غزل کی روایت خاصی پرانی ہے۔ غزل کی ابتدا ساتویں صدی میں امیر کروڑ سے منسوب کی جاتی ہے اس بات کو کسی حد مستند بھی نہیں سمجھا جاتا۔ دسویں صدی ہجری میں ارزانی خویشکی کی غزل گوئی ہر قسم کے شک و تردد سے مبرا ہے۔ خوشحال و رحمان اور کئی دیگر کلاسیکی شعراء نے پشتو میں غزل گوئی کی روایت کو مستحکم کیا۔

پشتو میں جدید غزل کا آغاز بھی بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں سے کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں امیر حمزہ شنواری (1994-1992) کو قدیم و جدید غزل کے اتصال کی کڑی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جدید غزل کی یہ روایت قیام پاکستان سے پہلے شروع ہوئی تھی اور قیام پاکستان کے بعد بھی جاری و ساری رہی۔ کئی شعراء ایسے ہیں جنہوں نے قیام پاکستان سے پہلے جدید پشتو غزل میں نئے نئے تجربے کیے اور پھر اسی اسلوب کو قیام پاکستان کے بعد تقویت دی۔

اسلوب و تکنیک کے حوالے سے قدیم و جدید غزل میں زیادہ فرق نہیں مگر موضوعات، میلانات اور رجحانات کے سلسلے میں پشتو غزل قیام پاکستان کے بعد نت نئے فکری حوالوں سے روشناس ہوئی۔

پشتو میں جدید غزل کی ابتداء بیسویں صدی میں ہوئی۔ جیسا کے پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ تکنیک کے حوالے سے قدیم، جدید غزل میں زیادہ فرق نہیں ہے اس لئے جدید غزل میں بھی غزل کی وہی روایت نظر آتی ہے جو قدیم غزل میں ہے۔ وہی تشبیہات، استعارے، علامات، لوازمات صنائع بدائع، وغیرہ۔ اصل جدت معنوی لحاظ سے آئی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ قدیم غزل کا روایتی رنگ اگر جدید غزل میں نظر آتا ہے تو وہ ایک منفرد انداز اور نئی تازگی کے ساتھ موجود ہے۔ اس لئے ہم پشتو غزل میں جدت کو قدیم و جدید کا سنگم بھی کہہ سکتے ہیں۔

جدید غزل کا سب سے بڑا اور نمائندہ شاعر امیر حمزہ شنواری بابا کو کہا جاتا ہے۔ حمزہ بابا جی کی غزل کو کلاسیکی اور رومانوی غزل کا امتزاج بھی کہا جاتا ہے اور قدیم و جدید غزل کی زنجیر میں درمیانی کڑی بھی۔ گویا حمزہ بابا کی غزل ایک پل ہے جو جدت کو قدیم روایت سے ملاتا ہے۔ انہوں نے معنوی جدت کے

علاوہ قدیم فنی روایت کو ایسی تازگی کا احساس دیا جو صرف امیر حمزہ بابا کا حصہ ہے اور صرف ان ہی کا اسلوب ہے۔ حمزہ بابا کو پشتون معاشرہ میں رئیس المتغزلین یعنی غزل کا بادشاہ اور بابائے غزل بھی کہا جاتا ہے۔ پشتو کے ممتاز کلاسیکل شاعر کاظم خان شیدا کی ایک غزل کے طرح مصرعہ:

"سیاه مار په نظر نه راځي ماشوم دے"

پر جب حمزہ بابا نے ایک مشاعرے میں اپنی غزل کا یہ شعر سنایا کہ

تورې سترګې مې د يار مخ ته ښې زيږدي

بيا حبشو په کعبه نزولے لام دے

ترجمہ: "میری کالی آنکھیں محبوب کے حسین اور مقدس رخسار کو یوں تک رہی ہیں جیسے حبشیوں نے ایک دفعہ پھر کعبہ پر حملہ کرنے کی ٹھانی ہو"۔

غزل کے اس شعر کو سننے کے بعد ممتاز شاعر سمندر خان سمندر نے حمزہ بابا کو "غزل کا بادشاہ" کہا تھا۔ بعد میں آپ بابائے غزل کے نام سے مشہور ہو گئے۔

حمزہ بابا خود مرزا خان انصاری اور خوشحال خان خٹک سے متاثر ہونے کا اعتراف کرتے تھے لیکن میری نظر میں آپ تکنیک اور تغزل کے حوالے سے رحمٰن بابا اور کاظم خان شیدا سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔

حمزہ بابا کے دور میں اور بعد کے جدید غزل نگاروں نے پشتو غزل کے دامن کو اتنا وسیع کیا کہ غزل اب پشتو ادب کی ایک لازوال صنف بن گئی ہے۔ جدید غزل کہنے والوں نے فنی اور فکری حوالے سے غزل میں وہ رنگ و آہنگ پیدا کیا کہ غزل اب عربی اور فارسی کی دین نظر نہیں آتی بلکہ یہ پشتو کی اپنی صنف معلوم ہوتا ہے۔ جدید غزل نگاروں میں رومانویت کے علمبرداروں نے اگرچہ تغزل کی شان کو برقرار رکھا ہے۔ غزل میں شگفتگی، شائستگی، ملائمت اور رنگینی پیدا کی ہے لیکن زبان کی سلاست، فنی پیچیدگیوں سے آزادی اور غزل میں فطری رنگ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ طاہر کلاچوی، دوست محمد کامل، بخش طلیل وغیرہ نے کلاسیک و جدید کا امتزاجی رنگ پیش کیا ہے۔ اکرم فاروق شنواری، ناظر شنواری، تمیر آفریدی، ساحر آفریدی اور تمیر کے دیگر شعراء حمزہ بابا کی غزل کی فنی گرفت کے سحر سے نکل نہ سکے۔ فضل حق شیدا، سید رسول رسا، یونس خلیل، سیف الرحمٰن سلیم، عبدالرحیم مجذوب، اشرف مفتون، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، اکرام اللہ گران، خاطر آفریدی، ساجد اور فیضی، یوسف خان، اور کزئی، رحمت اللہ درد، سید شاہ سعود، درویش درانی اور پیر محمد کاروان غزل کے ایسے شعراء ہیں جن کی غزل کا اپنا رنگ، ڈھنگ اور منفرد اسلوب ہے۔ قلندر مومند، ابو

صابر، ولی محمد طوفان، اجمل خٹک، سلیم راز، عاصم بخت گری، سعد اللہ خان حیران وغیرہ ترقی پسند فکر کے وہ
شعراء ہیں جو غزل میں مضمون و مفہوم کے موثر ابلاغ و اظہار کے حامی بھی ہیں۔

رب نواز مائل، عبدالسلام اشیزی، مقدس خان معصوم، سعید گوہر، عمر گل عسکر، رازق فہیم، لیاقت
تایاب، عابد شاہ عابد، راز محمد، سرور سودائی، خیر محمد عارف، سہیل جعفر، محمود ایاز، خلیل باور وغیرہ بلوچستان سے
محمد صدیق پسر لے، سلیمان لائق، عبدالباری جہانی، اسحاق ننگیال، حبیب اللہ رفیع اور جدید دور کے چند دیگر
شعراء افغانستان سے ہیں۔ ان کے علاوہ منظر بیٹنی، مراد شنواری، سعد اللہ جان برق، شمس الزمان شمس، ڈاکٹر
اسرار، بشر نوید، شمس القمر اندیش، قمر راہی، عبداللہ جان مظلوم، غازی سیال، رحمت شاہ سائل، یاسمین یوسفز
ئے، اسلام ارمانی، امیر منگل، عرفان خٹک، اظہار اللہ اظہار، زبیر حسرت، ہمایوں ہما، حنیف قیس، سید
ماموں الرشید، محمد سعید سعید، حسین احمد صادق، ریاض تسنیم، قیصر آفریدی، صابر شاہ صابر، الطاف خٹک، مقدر
شاہ مقدر، کلیم شنواری، اسمٰعیل گوہر، احمد جان مروت، قیوم مستانہ، جاوید اقبال، حساس، ہارون سودائی،
شاہین سودائی، بیتاب جاذلوی، صاحب شاہ صابر، عمر دراز مروت، یوسف خان جاذب، فضیل سبحان عابد،
زاہد خان زاہد، ریاض شاداب، جوہر خلیل، افتخار بخاری، عبدالستار عارف خٹک، ڈاکٹر شیر زمان طائزی، فوزیہ
انجم، حسینہ گل، سلمیٰ شاہین، ناہید سحر اور چند دیگر شعراء و جوان شامل ہیں۔ یہ فہرست خاصی طویل ہے اس لیے
دیے گئے چند ہی نام کافی ہیں جنہوں نے پشتو غزل کی ترویج اور ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

جیسا کہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پشتو غزل میں رومانویت اور جمالیات کے
ساتھ ساتھ مقصدیت اور سماجی شعور کا ترجمان غالب رجحان 9/11 کے واقعہ سے پیدا شدہ اثرات بھی ہیں
۔ اگر چہ دیگر سیاسی اور سماجی مسائل بھی پشتو غزل کے نمائندہ موضوعات رہے مگر مذکورہ واقعہ کو بڑی شدت
سے شعراء نے اپنی شاعری کا بالعموم اور اپنی غزل کا بالخصوص موضوع بنایا۔ اس لئے قیام پاکستان کے بعد کی
پشتو غزل میں 9/11 کے واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

لہٰذا اس بحث میں ان تمام شاعروں کی غزلوں کا ان اثرات کے حوالے سے احاطہ کرنا مشکل
ہے البتہ غزل کے چند منتخب نمونوں کے ذریعے ان اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ افغانستان کے شعراء نے
اگر چہ سب سے زیادہ 9/11 کے اثرات کو اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے لیکن وہاں چونکہ مجموعی طور پر غزل
سے زیادہ نظم کی صنف میں طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ اس لیے 9/11 کے اثرات کو عموماً نظم ہی میں منعکس کیا
گیا ہے۔ پاکستان میں پختونخوا کے تقریباً تمام شعراء نظم کے ساتھ ساتھ غزل کی طرف بھی شدت سے متوجہ

ہیں، اس لیے یہاں کی شاعری میں غزل کی صنف میں بھی ان اثرات کا عکس دیکھا جاتا ہے، لیکن یہاں کے شعراء میں بھی صرف انتخاب ہی کو مدنظر رکھا جا سکتا ہے تمام شعراء کی غزلوں کا اس تناظر میں جائزہ لینا ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے۔

پشتو میں اس واقعہ کے اثرات کا زیادہ تر نوجوان شعراء نے منعکس کیے ہیں مگر ساتھ ہی کچھ سینئر شعراء کی غزلوں میں بھی اس کا انعکاس نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم 9/11 کے اثرات کو دو نمایاں حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ حصہ جس میں شاعروں نے براہ راست اسامہ بن لادن، طالبان، امریکہ اور اس واقعہ سے پیدا ہونے والے حالات واقعات کی تصویر کشی کی ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں شعراء نے براہ راست تو ذکر نہیں کیا مگر اس واقعہ کے تاثر میں انسانی حقوق کی پامالی، انتشار و بے چینی، دہشت گردی اور انسانی مظالم کا نقشہ کھینچا ہے۔ پشتو غزل کے ان دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے نوجوان اور سینئر دونوں طبقوں کی غزلوں سے نمونے پیش کر کے اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔

سیف الرحمٰن سلیم پشتو غزل کے چوٹی کے شعراء میں سے ہیں۔ ان کی غزل عموماً رومانوی اثرات کی ترجمان ہوتی ہے مگر ساتھ ہی ان کی فکر میں ترقی پسند رجحان اور مقصدیت کا رنگ بھی انتہائی خوبصورت پیرائے میں جھلکتا ہے۔ سلیم مرحوم کے آخری مطبوعہ مجموعہ "دوړه دوړه خدایانو دی بنده کړم" (اے خدا میں تو چھوٹے چھوٹے خداؤں کا بندہ بن گیا ہوں) جو ان کے پہلے مجموعے "سندریز وهلتونه" (محترم شفق) کی شاعری بھی شامل ہے، میں وہ براہ راست اسامہ اور طالبان کا تذکرہ کرتے ہوئے، خطہ میں امن و امان کی پامالی کا نقشہ کھینچتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کاشکی چې سیند مه می سمسور کړی د سپرلی بادونه
ستا ملګرتیا وی بېبی غمی وی هر خوا امن، امان
سلیمه چپ شه ګاوندی دی نا خبره نه دے
ډنګه نازل شو اسامه، چا زیږول طالبان(١٠١)

ترجمہ: کاش میری سرزمین موسم بہار کے پھول کھلاتی اور میں تیری رفاقت میں ایک پرسکون ماحول میں غموں سے بے نیاز سیر کرتا، جہاں ہر طرف امن و امان ہوتا۔ سلیم! خاموش رہو۔ تیرا پڑوسی بے خبر تو نہیں۔ دیکھتے نہیں کہ اسامہ کیسے نازل ہوا اور طالبان کو کس نے جنم دیا۔

سلیم مرحوم نے اس منتشر معاشرہ میں ظلم و ستم، جہالت و نفرت اور بے چینی کی تصویر کشی اپنی

غزلوں کے دیگر اشعار میں بھی کی ہے۔ چند اشعار پیش نظر ہیں۔

هر وګړے چې و قام مې وژل کیږي
ماته داسې درد رارسي لکه زه مړم

ترجمہ: میری قوم کا ہر فرد جب قتل ہوتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ہی مر رہا ہوں۔

داسې کلي کښې مې خلقه بود و باش دے
چې تاريخ ئې خون آلود اور دلخراش دے
که خاوری دے که عالم زما د خاوری
په عالم کښې ئې شناخت د بدمعاش دے
د جهان د استعمار لاس کښې ډو بېزې
هر باچا زما د ملک باچا د تاش دے (۱۰۲)

ترجمہ: میری بود و باش ایسے گاؤں میں ہے جہاں کی تاریخ خون آلودہ ہے۔ میری مٹی کا غازی ہے یا عالم، دنیا میں اس کی شناخت ایک بدمعاش ہی کی ہے۔ میرے ملک کے ہر بادشاہ کے ہاتھوں میں یوں کھیلا جاتا ہوں جیسے: تاش (play card) کا بادشاہ ہے۔

مجموعی طور پر افغان جنگ اور خصوصی طور 9/11 کے اثرات کے حوالے سے سب سے اہم شاعر علی اکبر سیال ہے۔ سیال کی شاعری کا بنیادی موضوع جنگ و دہشت سے نفرت اور امن و سکون سے محبت ہے۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں کوئی بھی مجموعہ اس موضوع پر مشتمل شاعری سے خالی نہیں ہے۔ ستمبر 2001ء سے پہلے کے مجموعوں میں انہوں نے مجموعی طور پر خطے میں انتشار کا نقشہ کھینچا ہے اور 9/11 کے بعد اس واقعے سے پیدا ہونے والے اثرات کو بعد میں مجموعوں میں سمویا ہے۔ سیال کے مجموعوں کے نام ہی اس موضوع سے متعلق ہیں مثال کے طور پر "یه جنګ دی اور اولګی" (جنگ کو آگ لگے) اکتوبر 2000ء "دا پر عروته یه ګندل غوری" (ان زخموں کو پیوند چاہیے گا) ستمبر 2005ء، سسکیوں بھری مسکراہٹ، 2008ء، میرے دیس میں فسادات پھیلائیں، 2009ء، ان مجموعوں میں آخری مجموعے کو 9/11 کے حوالے سے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، اس مجموعہ میں علی اکبر سیال نے اپنی سرزمین کو اس گلوبل ویلج کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری سرزمین میں جنگ و فسادات پھیلایا جائے۔ اپنی تمام تر شاعری میں انہوں نے نظم میں کھل کر اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے مگر ساتھ ہی ان کے تحت

غزلوں میں بھی ان اثرات کا عکس پیش کیا ہے۔ سیال کی شاعری میں سے صرف چند غزلوں سے منتخب اشعار پیش کر کے جنگ و دہشت کی وجہ سے پھیلے ہوئے انتشار اور امن و امان کی شدید خواہش کا تاثر نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخری مجموعے میں سیال غزل کے پیرایہ میں کہتے ہیں۔

عفه په خپل وطن کښې نه کوني د جنګ و عظونه
عفه زما کورته راوړې دذلت تصور (۱۰۳)

چې چې د خدای ثنا، کونه د تسبیو په دانو
نن هغه خلق د سر ونو کاروبار کوني (۱۰۴)

سر سلامت د هر انسان غوارم
امن د ځان هم دجهان غوارم (۱۰۵)

د جنګ لمبو ته لمن نه وهمه
سیاله دا کار د پیر ننګې نه کوم (۱۰۶)

زما د کلي د وطن خلق ئې تول وخوړل
سیاله که ورکه دا بلاشي نور څه نه غوارمه (۱۰۷)

زه د تولې دنیا امن او سکون یم
خدائي زده چا لیونے کړے زن پرون یم (۱۰۸)

ترجمہ:

وہ اپنے وطن میں تو جنگ کے وعظ نہیں کرتے مگر اس ذلت کو میرے گھر لے آیا ہے۔ وہ لوگ جو تسبیح کے دانوں پر خدا کی توصیف و ثنا کرتے تھے، وہ آج کل انسانوں کے سروں کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں ہر انسان کا سر سلامت چاہتا ہوں۔ اپنے لئے بھی اور تمام جہاں کے لئے بھی امن کا خواہاں ہوں۔ میں جنگ کے شعلوں کو ہوا نہیں دیتا۔ مجھے فرنگیوں کا یہ کام نہیں کرتا۔

اس نے تو میرے گاؤں اور وطن کے تمام لوگوں کو ڈس لیا ہے۔ اے سیال! اگر یہ اژدھا چلا جائے تو میں اور کچھ نہیں مانگتا!

میں تو ساری دنیا کے لئے امن و سکون کا خواہاں ہوں مگر خدا جانے آج کل کس نے مجھے پاگل بنا کر دہشت پر آمادہ کیا ہے۔ سیال کی اس قسم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مذکورہ مجموعے کے مقدمہ نگار

خالق زیاد کی رائے پر اکتفا کرتا ہوں، جس میں وہ کہتے ہیں۔

"سیال کے اس مجموعے کی شاعری کا بنیادی موضوع پشتون سرزمین میں حالیہ انتشار، دہشت ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ عالمی قوتوں کی کیا ترجیحات ہیں، پاکستانی اداروں کا اصل مدعا کیا ہے۔ مذہبی جماعتیں اور جہادی تنظیمیں کیا کر رہی ہیں، کس لئے کر رہی ہیں اور کیوں کر رہی ہیں اور ساتھ ہی سیال یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ ایسی صورت حال میں پشتونوں کو من حیث القوم کیا کرنا چاہئے (۱۰۹)

کوئٹہ کے شاعر درویش درانی نے جنگ و دہشت کے خلاف عمومی طور پر اپنی شاعری میں شاعرانہ آواز اٹھائی ہے اور 9/11 کے بعد زیادہ شدت سے اس موضوع پر لکھا ہے۔ وہ عمومی طور پر نظم کے ایک مایہ ناز شاعر ہیں، مگر غزل میں بھی اس جانب توجہ دی ہے۔ اپنی سرزمین اور اپنی قوم و ملت کی بے بسی اور جہالت پر روتے ہیں۔ 4 اکتوبر 2001ء کی لکھی ہوئی ایک غزل میں علامتی انداز میں کہتے ہیں۔

جنگ ته نې اسلوی خوانان تر سبېن قرآن و باسی
له دغه نېکه کاره ته مگر خپل خان و باسی
جنگ چې کتبو تر ما اور ورور ته سره و جنگوی
دشمن په روغه کنکری زمو نږ تر منځ و باسی
له هری خوا راځی زخمونه او درویش وائی دا
خدایه له دی وطنه ته دا سره مار ځان و باسی (۱۱۰)

ترجمہ:

دوسروں کو جنگ کی ترغیب دیتے وقت قرآن کی قسم بھی دیتے ہو مگر خود اس نیک کام میں حصہ نہیں لیتے۔ جنگ جیتنے کے لئے میرے بھائی سے لڑاتے ہو مگر اصل دشمن کو صحیح سلامت ہمارے درمیان سے نکال دیتے ہو۔ ہر طرف سے زخموں ہی زخموں کی خبر آتی ہے۔ اس لیے درویش خدا سے ملتجی ہے کہ اس وطن کو ان سرخ پرندوں سے نجات مل جائے۔

خیبر ایجنسی سے تعلق رکھنے والے پشتو کے نامور شاعر مقدر شاہ مقدر نے اپنی شاعری میں 9/11 سے پیدا ہونے والے اثرات کو بہت توجہ اور شدت سے بیان کیا ہے۔ مقدر کے غیر مطبوعہ "ګلونو پانډیری" (پھولوں کے ڈھیر) میں اس جانب بہت بلیغ اور واضح اشارے ملتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں کابل اور پشاور دونوں کے درد و الم کو یکساں محسوس کرتے ہیں۔ وہ کابل و پشاور کے لئے بالائی اور زیریں کی اصطلاحات

استعمال کرتے ہوئے دونوں خطوں کے باشندوں کو اپنے بھائی سمجھتے ہیں اور دونوں کے درد پر اظہار افسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

اغیارو بل کړه هر طرف ته د حسد اور ونه
چکښې یو ورور می کوز لمبه شو بل می بر لمبه شو(۱۱)

ترجمہ:

غیروں نے ہر طرف حسد کی آگ لگائی ہوئی ہے جس میں میرا ایک بھائی زیریں خطہ اور دوسرا بھائی بالائی خطہ میں جھلس گیا۔

کابل پر لگی ہوئی آگ کے کچھ عرصے کے لئے بجھنے کے بعد بھی وہ کہتے ہیں کہ

د بارود اور که خو له امنه سوړ دے
خو لا اوس هم له کابل نه لوګے خیژي(۱۲)

ترجمہ: اگرچہ آتش امن کی وجہ سے بارود کی آگ عرصے کے لئے ٹھنڈی ہوگئی ہے۔

شباب رانریزے خطہ سوات کے ممتاز شاعر ہیں اور یہ واضح رہے کہ 9/11 کے واقعے نے پختونوں کے جن خطوں کو بری طرح متاثر کیا ہے، سوات اور ملحقہ علاقہ جات ان میں بہت نمایاں ہیں۔ شباب ان اثرات کا عکس یوں پیش کرتے ہیں۔

دا د بارودو هوا کاني له کوم لوري راځي
چې ني لمبه زما د ګل جانان تر کوره راځي
یمه پښتون په ما بل خوک بلوسی کولے نه شي
ما له زما د قتل بوی زما د وروره راځي (۱۳)

ترجمہ:

آؤ اس مظلوم شہر کا نظارہ دیکھو جس میں آگ کے شعلوں کی وجہ سے خون ہی خون اور جلتی ہوئی گوشت کی بو آتی ہے۔ یہ بارود سے بھری ہوائیں کس جانب سے آ رہی ہیں جس کے شعلے میرے پھول ایسے محبوب کے گھر تک آ پہنچے۔

میں پختون ہوں کوئی دوسرا مجھ پر حملہ کر ہی نہیں سکتا، مجھے میرے قتل کی بو میرے بھائی سے آتی ہے۔

شباب نے اپنی غزلوں میں پشاور مرحوم کے مرثیے بھی کہے ہیں ان کی دو غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کرتا

ہوں۔

دخپل ارمان د پیښتور نه چی پلو اخلمه
لکه د وینو د منظر نه چی پلو اخلمه
په دی گناه زما قاتل زما د مرگ نه تیر دے
دی د خپلی خاوری د دی ښر نه چی پلو اخلمه
دی د ظلمونو قصدی نی په سینو لیکلی
د کوم چینار د کوم زرنتر نه چی پلو اخلمه
ستر گو کښی او بڼکی غر یو نیو لی اسویلی په شونډو
د پښتو ذخوا د ماز یگر نه چیپلو اخلمه (۱۱۳)

ترجمہ:

اپنے ارمانوں کے پشاور سے جب نقاب اٹھاتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے ایک خونی منظر سے پردہ اٹھاتا ہوں۔

جس جرم پر تو میرا قاتل مجھے قتل کرنے پر اتر آیا کہ میں اپنی مٹی کے اس شہر کی پردہ کشائی کرتا ہوں۔

جس درخت کو دیکھتا ہوں تو اس کے سینے پر مظالم کے قصائد کندہ نظر آتے ہیں۔

میں جب بھی پشتو خوا کی ہر شام کو دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں چھلکتے آنسوؤں اور ہونٹوں پر درد بھری آہوں اور سسکیوں کا سماں ہوتا ہے۔

پشاور کو پھولوں کا شہر کہتے ہیں اور جب پھولوں کے اس شہر پر انگارے برسنے لگے تو شاپ کہتا ہے۔

د دی گلونو په ښار چا سکروټی اورنوستلی
په هر قدم دی ژړاگانی راالہ زره ورانوی
نور دے هر څه ببهه اسمان سره خبری کوی
دلته کښی دی دیښی ارزانی راالہ زره ورانوی
چا د نظر د دی خاوروی کری بدنسته نظاری
لمبی لمبی دی ورشو گانی راالہ زره وراونی (۹۵)

ترجمہ: اس پھولوں کے شہر پر کس نے انگارے برسادیے۔ قدم قدم پر سسکیوں کی آوازیں میرے دل کے گلستان کو قبرستان بنا دیتی ہیں۔ باقی تمام چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں مگر یہاں صرف خون کی بہا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ کس نے اس مٹی کے خوبصورت مناظر کو نظر لگادی جو ہر جگہ الاؤ سے بھی شعلے اٹھ رہے ہیں۔

پختونخوا کے ہر دلعزیز رومانوی غزل گو شاعر رحمن اللہ درد بھی 9/11 کے اثرات کا عکس اپنی شاعری میں سموئے بنا نہ رہ سکے۔ ان کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کرتا ہوں۔

ډرې کوڅې دي که ګودر لوګې دې
هر څه نه تاو لکه چادر لوګې دې
نا دې زما تر کور را اور سېځو
زه مطمئن وم چې بهر لوګې دې
کابل کشمیر که فلسطین دې درده
نن د مشرق هر یو منظر لوګې دې (۱۱۹)

ترجمہ: میرے وطن کی ہر چیز استعمار کے ظلم و ستم کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے خواہ گلی کوچے ہیں یا پنگھٹ ہر کہیں دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔

یہ دیکھو! میرا گھر بھی اس آگ میں جل گیا ہے جبکہ میں تو اطمینان سے بیٹھا تھا کہ مجھ جیسے فقیر سے کس نے کیا لینا دینا ہے۔

اے درد کابل ہو یا کشمیر یا پھر فلسطین آج تو مشرق کا ہر ایک منظر ظلم و ستم کے اس دھویں سے اٹا ہوا ہے۔

کراچی میں رہائش پذیر پشتون شعراء میں سے ریاض تسنیم، قیصر آفریدی اور طاہر بونیری نے اپنی غزلوں میں اس المیہ کی نقاب کشائی علامتی انداز میں کی ہے۔ ریاض تسنیم غزل کے پیرایہ میں کہتے ہیں۔

ذل خپل مرکز د خپل وجود نه ګریزان دي خلق
د چا جزده نی لاس کښې، چا پسې روان دي خلق
د زندګۍ منډې د خپلو مړو شمېر پاتې ده
اوس په تلاش د کوم خواهش د کوم ارمان دي خلق

چې اُرس کانه دی ، هم رانده دی هم کونګیان دی خلق (۲۷)

ترجمہ: یہاں لوگ اپنے مرکز اور اپنے وجود سے گریزاں ہیں۔ معلوم نہیں کس کا جھنڈا ہاتھ میں لیے کس کے پیچھے جا رہے ہیں۔

اب تو زندگی کے معنی محض اپنے شہداء کی لاشوں کی گنتی رہ گیا ہے۔ اب یہ لوگ کون سی خواہش اور کون سے ارمان کی جستجو کریں گے۔

لوگ خودکشی کی لذت میں اتنے مست ہوگئے ہیں کہ اب وہ گونگے، اندھے اور بہرے ہو کر رہ گئے ہیں۔

قیصر آفریدی اپنے آخری مجموعے 9/11 کے واقعے سے پیدا المیے کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

داسې کوڅې داسې وطن دے زما
د هر دیوال سیورے دشمن دے زما
په جنګ کښې څوک د چا په ضد ولاړ دے
ټوپک زما دے هم بدن دے زما
ستا نمرودو اور مې زړه ته تنور شو
دا چې اواز دومره تاوجن دے زما (۲۸)

ترجمہ: میرا وطن اور میرے گلی کوچے کچھ اس طرح سے ہیں کہ ہر دیوار کا سایہ میرا دشمن بن گیا ہے۔
جنگ میں کون کس کے خلاف کھڑا ہے؟ بندوق بھی میری اور نشانہ بھی میں ہوں۔ تیری بارود کی لگائی ہوئی آگ دل تک آ پہنچی۔ اسی لئے تو میرا لہجہ بھی آتش فشاں بن گیا ہے۔

طاہر بونیری کے چند اشعار اس المیے سے متاثر پشتون سرزمین اور پشتون قوم کی زبوں حالی کا تاثر پیش کرتے ہیں جو اس طرح ہیں۔

ملګرو مه ژاړئ کابل په اوښکو نه جوړیږي
کابل ارام ته وارثان د پیغمبر نه پرېږدي (۲۹)
د دې اولس د بې حسۍ علاج نور څه کېدے شي
خو په دې خاوره بم بمو نه نور زوال پاتې دی (۳۰)
زه چې بې حسه شم ، باغي شم نو بارود ایجاد کړم

چې سخن ور شم ، نغمه گر شم ذو غزل اولیکم (۱۴۱)

ترجمہ: دوستو مت رہو، کیونکہ کابل کے زخم آنسوؤں سے نہیں بھرتے۔ کابل کے زخموں کو یہی نبی کے نام نہاد وارث بھرنے نہیں دیتے۔ اس قوم کی بے حسی کا علاج اور کیا ہو سکتا ہے بس یہی کہ اس سر زمین پر اور بھی بم برسنے رہ گئے ہیں۔

میں جب بے حس اور باغی ہو جاتا ہوں تو بارود ایجاد کر لیتا ہوں اور جب بھی میں سخن ور اور نغمہ گر ہو جاتا ہوں تو غزل کہہ دیتا ہوں۔

طاہر بوئیری کے مذکورہ اشعار میں بارود ایجاد کرنے والے اور سرزمین پاک پر بم برسانے والوں کو بے حس اور باغی کہا گیا ہے اور طنزیہ لہجے میں نبی ﷺ کے وارث یعنی نام نہاد جہادی اور مذہبی طبقوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اسی سلسلے میں کابل کے زخموں پر روتے ہیں۔ اسی طرح بنوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان شاعر جاوید احساس جو غزل کے بہت خوبصورت شاعر ہیں کی غزلوں میں اس بے حسی کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جاوید کے چند غزلیہ اشعار یہ ہیں:

نه دا معلومه شوه احساسه چې چا روژلم
نه دا معلومه شوه چې چامې خون بها واخیسته (۱۴۲)
په درد ناک دور کښې بد حال سره مخ شوې یمه
زه د در دونو ، د زوال سره مخ شوې یمه (۱۴۳)
دې له جنت ویستې انسان له خو غیرت پکار وه
په دغه زمکه خو په هر صورت جنت پکار وه (۱۴۴)

ترجمہ: اے احساس نہ تو یہ معلوم ہو سکا کہ مجھے قتل کس نے کیا اور نہ ہی یہ پتہ چلا کہ میرا خون بہا کس نے لیا۔

اس دردناک دور میں بہت برے حالات کا سامنا کر رہا ہوں میں کرب و الم اور زوال ہی زوال کو دیکھ رہا ہوں۔

اس جنت سے دھتکارے ہوئے انسان کو تو کچھ غیرت اور شرم آنی چاہی تھی ایسی صورت میں تو اس زمین پر ہر حال میں جنت کا منظر ہونا چاہیے تھا۔

ژوب صوبہ بلوچستان سے تعلق رکھنے والے دو نوجوان شعراء داؤد بخت مندخیل اور رحمن زلے

9/11 کے بعد پشتون سرزمین کا خونی منظر دکھاتے ہوئے اپنی شاعری کا محرک ہی اس موضوع کو سمجھتے ہیں داور بخت کہتے ہیں۔

چې خوار مې ثرت، بدای مې مرسی د اسلام پر نامه

چې کلی تاتر ہے مې برباد سی نو اشعار ولیکم

چې د کلونو او باغونو بنانسته وطن مې

په هدیره بانډي آباد سی نو اشعار ولیکم

زمونږ په خاوره جوړ جهاد سی نو اشعار ولیکم (۱۲۵)

ترجمہ: جب بھی میرا غریب وطن اسلام کے نام پر لٹ آتا ہے اور میرے بڑے بوڑھے قتل ہو جاتے ہیں اور جب میں میرا گھونسلا بکھر اولیں برباد ہو جاتا ہے تو میں اشعار کہتا ہوں۔

جب بھی پھولوں اور باغوں جیسا میرا پیارا دیس قبرستان میں بدل جاتا ہے تو میں اشعار کہتا ہوں۔ جب بھی باطل ملاؤں کے کہنے پر میری مٹی میں نام نہاد جہاد شروع ہو جاتا ہے تو میں اشعار کہہ دیتا ہوں۔

رحمت زلے منفرد و شعل جو دینی و اسلامی جذبے سے سرشار نوجوان شاعر ہیں۔ 9/11 کے واقعہ سے جنم لینے والی صورت حال اور انتشار کا ذمہ دار مغربی قوتوں کو ٹھہراتے ہیں اور اپنے جذبہ ایمانی کا اظہار اور حالات کی نقاب کشائی کرتے کہتے ہیں کہ میں غزل لکھتا ہی تب ہوں جب ظلم و ستم حد سے بڑھ جاتا ہے چند اشعار درج ذیل ہیں:

چې پر نړۍ د ظلم شپه شي نو غزل ولیکم

چې و ظلمت تیاره خوره شي نو غزل ولیکم

چې فرنګیان ئې ولمبه اور لیب ووهي

چې د کابل جامه ایره شي نو غزل ولیکم (۱۲۶)

ترجمہ: جب بھی دنیا پر مظالم کی رات آ جاتی ہے اور ظلمتوں کا اندھیرا چھا جاتا ہے تو غزل لکھ لیتا ہوں۔ جب بھی فرنگی آگ کو بھڑکانے کیلئے دامن ہلاتے ہیں اور کابل کی خوبصورتی کو راکھ کر دیتے ہیں تو میں غزل لکھ لیتا ہوں۔

اس طرح صوابی سے تعلق رکھنے والے شاعر بخت شیر اسیر 9/11 کے اثرات کو براہ راست اپنی

غزل کو موضوع بناتے ہیں۔ کابل، قندہار اور پختونخوا میں لگی آگ کی تصویر دکھاتے ہیں اور مجموعی طور پر اس تباہی کے ذمہ دار اگر ایک طرف امریکہ اور دیگر مغربی قوتوں کو ٹھہراتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں اس تباہی میں ہمارے اپنے لوگ بھی برابر کے شریک ہیں، جن کو وہ ڈالرز کے عوض بکے ہوئے ضمیر فروش کہتے ہیں۔ بخت شیر کے چند اشعار یہ ہیں۔

د زړه کابل مې د اغیار په راکټونو لګی
تاریخي کور له مې نن اور په سازشونو لګی (۱۲۷)
بیا د زړه نه مې جوړ بنار د قندهار دے
د بمونو شپه او ورځې پرې بمبار دے (۱۲۸)
جنګ پردے وی خو مونږ په سر واخلو
ژمونږ ټول عمر جنګونو سره ژوند دے (۱۲۹)
په ډالرو بیعه کیږی که عوام دی که خواص دی
ضمیر خرڅه معاشره کښې حساس زړونه په سلګو دی (۱۳۰)

ترجمہ:

میرے دل کا کابل غیروں کے راکٹوں کا نشانہ بن گیا ہے آج میرے تاریخی گھر کو سازشوں کی بنا پر آگ لگ رہی ہے۔

ایک بار پھر میرا دل قندھار بن گیا اور رات دن بموں کی بمباری کی زد میں آ گیا ہے۔

ہم دوسروں کی جنگ اپنے سر لے لیتے ہیں ہماری تمام زندگی حالت جنگ میں گذرتی ہے۔

ہر خاص و عام ڈالروں کے عوض بک جاتا ہے اسی لئے تو اس ضمیر فروش معاشرہ میں حساس دل سسکیاں ہی لیتے ہیں۔

صوابی کے ایک اور عوامی شاعر امیر مساوجلی والی جب غزل کہتے ہیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے وحشت کی تصویر پھر جاتی ہے۔

لوګی لوګی دی په هر خاکی کښې ماتمونه جوړ دی
ملک تباه کیږی هر څنډی دی الفتونه جوړ دی
د ښار کو ځو کښې خاموشی ده څه مزه نی ډیشته

کوم خوا ته لاړ شو په هر خای کښې سره اور وته جوړ دی
بیا زانه بنکاری چې په بنار کښې دهماکه شوری ده
په چا خلاصیری ، چا دا پاره دا بسونه جوړ دی
ملګرو ویبس شی دهشت ګردو پاکستان تباه کړو
زموږ په وینو آباد شوے ګلستان تباه کړو(۱۳۱)

ترجمہ:

ہر طرف دھواں ہی دھواں اٹھ رہا ہے اور ماتم کا سماں ہے ملک سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ آفتوں نے ملک کو تباہ کر ڈالا ہے شہر کے گلی کوچوں میں خاموشی چھائی ہوئی ہے۔
سکون پامال ہوا ہے۔ ہم کدھر جائیں ہر جگہ تو آگ بھڑک اٹھی ہے یوں لگ رہا ہے کہ پھر شہر میں بم پھٹا ہے یہ بم کس کو مارنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور کس پر داغے جا رہے ہیں۔
دوستو یا گویا دہشت گردوں نے پاکستان کو تباہ کر ڈالا ہمارے خون سے کھلے ہوئے اس باغ کو سنسان کر دیا۔
اسی طرح پشاور کے شاعر سلطان محمد سلطان ان تمام مظالم کا ذمہ دار امریکہ کو ٹھہراتے ہوئے اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے ساتھ صدر صدام حسین کو بھی ان مظالم کا شکار سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

تر کومې به کوی دا ظالمان په موږ ظلمونه
ور خو چې ورته کښېنو بنه صفا خبری اوکړو
حالات د مظلومانو چې سکار کړو دی دنیا ته
صدام، ملا عمر د اساما خبری اوکړو(۱۳۲)

ترجمہ: یہ ظالم کب تک ہم پر ظلم ڈھاتے رہیں گے۔ آئیں آج بیٹھ کر ذرا کھری کھری باتیں کرتے ہیں اور دنیا کو مظلوموں کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کچھ صدام، ملا عمر اور اسامہ کی باتیں کرتے ہیں۔
سلطان محمد سلطان امریکہ کو مسلمانوں کا دشمن سمجھتے ہوئے برملا کہتے ہیں۔

شوه راپورته سم د واره امریکه
مسلمانه ستا له پاره امریکه
د ایمان جذبه پخپله در کښې نشته

دی کنی نه ده گناه کاره امریکه
اتفاق او اتحاد خان کښی پیدا کړی
ذوره پر یږدی اد مرداره امریکه
د نړۍ مسلمانانو ذوره پریږدی
بد معاشه ، بد کرداره امریکه
چې بچي د پښتنو پسې راجګ شول
که خدائي کاندی شي به خواره امریکه (۱۳۳)

ترجمہ:

اے مسلمانو! امریکہ اچانک تمہیں نیست و نابود کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔
تم لوگوں میں خود ہی ایمان کا جذبہ نہیں۔ اس میں امریکہ زیادہ قصور وار بھی نہیں۔
آپس میں اتفاق اور اتحاد پیدا کریں اور اب اس مردار امریکہ سے جان چھڑائیں۔
اے دنیا کے مسلمانو اب اس بدمعاش و بدکردار امریکہ سے نجات حاصل کریں۔
اب پشتونوں کے بچے امریکہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اللہ نے چاہا تو اب امریکہ ذلیل ہو کر ہی رہے گا۔

قیام پاکستان کے بعد لکھی گئی پشتو غزل میں رومانوی عناصر کی ترجمانی بھی شدت کے ساتھ کی گئی ہے مگر اپنے دور کے حالات اور عصری آگہی کا شعور اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے اگرچہ پشتو شاعری کی دیگر اصناف پر قیام پاکستان کے بعد خاص توجہ دی گئی ہے مگر منظوم اصناف میں سب سے زیادہ توجہ غزل ہی کو دی گئی ہے۔ اس دور میں پشتو غزل تمام نئی جہات، رجحانات، موضوعات اور میلانات کے ساتھ ساتھ فنی تقاضوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد تمام شعری اصناف میں غزل ہی پشتون شعراء کی محبوب ترین صنف رہا ہے۔

☆☆☆

پشتون اہلِ قلم کی اردو ادب کے لیے خدمات
(قیامِ پاکستان کے بعد)

قیامِ پاکستان کے بعد پشتون اہلِ قلم نے ایک طرف تو پشتو ادب کی مختلف اصناف میں خاطر خواہ اضافے کیے تو دوسرے طرف انہوں نے اردو ادب کی مختلف جہات پر بھی لکھا۔ اردو ادب کی تخلیقی جہات میں سے شاعری کے علاوہ انہوں نے افسانوی ادب میں بھی بلند معیار کا ادب تخلیق کیا اور ساتھ ہی تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی قابلِ قدر کام کیا۔ اس بحث میں ہم پشتون اہلِ قلم کی اردو خدمات کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

بیسوی صدی کے جدید شعراء وادباء

بیسویں صدی میں جدید شعراء وادباء نے اردو ادب میں مختلف اصناف میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خوب نام ومقام بھی پیدا کیا۔ لہٰذا مناسب یہ ہوگا کہ جدید دور کے ادب کی مختلف اصناف کا الگ الگ جائزہ لیا جائے اس وضاحت کے ساتھ کہ ان شعراء وادباء کے علاوہ دو گروہ ایسے ہیں جن کو ہم اس زمرے میں شامل نہیں کریں گے۔ ایک گروہ میں وہ اہلِ قلم شامل ہیں جو نسلاً تو پشتون ہیں لیکن ان کا تعارف اردو ادب سے ہے۔ ان میں مرزا شیرانی، جمیل جالبی، امتیاز علی خان عرشی، جوش ملیح آبادی، میر عبدالصمد خان، اختیار علی نیّر، دلہ خان، سعید اختر، یوسف رضا چشتی، اشرف بخاری، یونس قیاسی، انجم یوسفزئی، خاور احمد خیال درانی، کلیم اللہ صدام، عصمت درانی وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرا گروہ جو نسلاً تو پشتون ہیں لیکن ان کو پشتون سمجھا جا رہا ہے اور ان کا تعارف بھی خالص اردو ادب سے ہے۔ ان میں شوکت واسطی، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، احمد فراز، محسن احسان، خاطر غزنوی، محمد سعید، صابر کلوروی، غلام محمد قاصر، تاج سعید، اعجاز راہی، جوہر میر، انوار خواجہ، عزیز اعجاز، طارق ہاشمی، شباب صفدر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ خواتین میں صبا جاوید، نرجس زیدی، ثروت، محسن احسان، بشریٰ اقبال، بشریٰ فرخ، منور رؤف اور حمیدہ [illegible] وغیرہ کے نام زیادہ روشن ہیں۔

ہم نے یہاں صرف ان اہل قلم کی اردو ادب کے حوالے سے بات کرنی ہے جو نسلاً بھی پشتون ہیں اور ان کا تعارف بھی پشتو ادب سے ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو ادب میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

شاعری

بیسوی صدی کے جدید شعراء میں فضل احمد غر جو اردو شاعر ہیں افغان تخلص کرتے تھے۔ ایسے شاعر ہیں جن کے پشتو شعری مجموعے میں پانچ غزلیں اور آٹھ رباعیاں اردو کی شائع ہوئی ہیں۔ یہ مجموعہ معروف محقق ہمیش خلیل کے تحقیقی مقدمے کے ساتھ 1957ء میں ادبی مرکز سرائے نورنگ سے چھپا ہے۔ افغان کی شاعری میں سادگی، برجستگی اور سلاست نمایاں ہے۔ طویل اور مختصر دونوں بحور میں مترنم شاعری کی ہے۔ موضوعات میں تنوع بھی نظر آتا ہے۔ رومانی، طنزیہ، قومی اور اصلاحی قسم کے مضامین زیادہ ملتے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

خدمتِ قوم ہے شعار میرا
یہ نہیں ہے کسی صلے کے لئے
میں حقیقت میں ہوں اس صدائے جرس
راہ گم کردہ قافلے کے لئے (۳۲)

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں اردو کے اہم ترین پشتون شاعر امیر حمزہ خان شنواری ہیں جنہوں نے ابتدا اردو شاعری سے کی تھی لیکن 1933ء میں اپنے مرشد کے کہنے پر پشتو میں لکھنے لگے۔ اپنی اردو شاعری کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ:

"اردو زبان کے مسلسل مطالعے کی وجہ سے نہ صرف نئے افکار و خیالات سے آشنائی حاصل ہوئی بلکہ لب و لہجہ بھی ہندوستانیوں کی طرح ہو گیا۔ اس دوران کئی بار دہلی اور اجمیر جانے کا اتفاق بھی ہوا اور جب 1941ء میں پشتو کی پہلی فلم "لیلیٰ مجنوں" کے گیت اور مکالمے لکھے اور دو سال بمبئی میں رہا تو اردو بھی اردو ہو گیا۔ بمبئی میں ایک اردو مشاعرے میں شریک ہوا۔ مشاعرے کا طرحی مصرعہ تھا "ہم انقلاب شام و سحر دیکھتے رہے"

اس طرحی مصرع پر حمزہ بابا کے چند غزلیہ اشعار یہ ہیں:

ہم ان کے آنسوؤں کے گہر دیکھتے رہے
وہ بھی تو جذبِ دل کا اثر دیکھتے رہے
دیکھا نہیں بدیدۂ سوز دروں قسم انہیں
ہم پردہ ہائے تار نظر دیکھتے رہے

معیار حسن جو ان سے ان کو دیکھ کر　　　کچھ مدعا نہیں تھا مگر دیکھتے رہے(۱۳۵)

حمزہ بابا اردو شاعری میں نظامی تخلص کیا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی حمزہ بھی لکھتے تھے۔ان کے اردو مجموعے میں کل ایک سو کے قریب غزلیات ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔حمزہ شنواری کی غزل پر پشتون ثقافت اور جمالی انداز کا رنگ نمایاں ہے۔تکنیکی حوالے سے غزلیں بلند پایہ ہیں۔اس دور میں سعدی الافغانی، دوست محمد کامل، حسین بخش کوثر یا خیلی اور طاہر کلاچوی نے بھی اردو میں غزل کہی ہے ان چاروں شعراء کی شاعری میں تصوف کی جھلک اور کلاسیکی انداز نمایاں ہے۔

کلاسیکی انداز کی شاعری سے ہٹ کر منفرد اسلوب کے شعر کہنے والوں میں ایوب صابر، مجبور خٹک، اجمل خٹک اور رحمت اللہ درد کے نام آتے ہیں۔ایوب صابر اگرچہ اردو شعر و ادب میں مدت سے پہچانے جاتے ہیں لیکن ان کا مجموعہ حال ہی میں "منحرف" کے نام سے شائع ہوا۔امیر حمزہ شنواری ان کو ادب کے بابا تک کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو پشتو دونوں زبانوں میں یکساں قلم اٹھایا ہے۔

منور خٹک کے دو مجموعے "سلگتے پھول" اور "دل کی بستی" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ان کی شاعری میں خاص بات زبان کی صفائی اور ترقی پسند فکر کی بازگشت ہے۔اجمل خٹک نے اردو کی آزاد نظم میں طبع آزمائی کی ہے اور نظموں کا مجموعہ جلاوطن کی شاعری کے عنوان سے شائع کیا ہے۔رحمت اللہ درد کا مجموعہ ابھی چھپا نہیں ہے لیکن وہ اردو کے ایک منجھے ہوئے شاعر ہیں۔غزل زیادہ کہتے ہیں ان کی غزل میں برجستگی و سلاست دیکھ کر میر کی سی غنائیت و روانی کا احساس ہوتا ہے۔اس دور کے دیگر شعراء میں ولی محمد طوفان، رب نواز مائل، سعید گوہر، پیر قطب شاہ، سرور سوداوی، ممتاز علی خان، اور زیتون بانو کے نام زیادہ روشن ہیں۔رب نواز مائل نے آزاد اور معریٰ نظم حتیٰ کہ نثری شعر میں اچھے خاصے تجربے کیے ہیں۔سعید گوہر غزل و نظم دونوں میں انفرادی اسلوب کے حامل ہیں۔ان کا مجموعہ "کلی دیوار" چھپ چکا ہے۔پیر قطب شاہ کی شاعری پر فارسی کا اثر نمایاں ہے۔سرور سوداوی زبان و بیان کی سادگی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ممتاز علی خان سیاسی اور سماجی مسائل کے حوالے سے طنز کے ساتھ مزاحیہ رنگ بھی اپناتے ہیں۔اس کے بعد جدید پود کے شاعر آتے ہیں جن میں میجر الطاف خٹک، اظہار اللہ اظہار، سید شاہ سعود، علی کمیل قزلباش، فیض محمد شہزاد، ارشد سلیم اور دیگر شعراء کے نام آتے ہیں جن سے مستقبل میں کافی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

فکشن

فکشن کے میدان میں پشتون اہل قلم نے اگرچہ زیادہ کام نہیں کیا لیکن پھر بھی چند نام ایسے ہیں جو بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں اور ساتھ ہی چند نئے لکھنے والے بھی لکھ رہے ہیں۔ اردو کے حوالے سے ایک معتبر نام رحیم گل کا ہے۔

"آپ شکر درہ ضلع کوہاٹ کے ایک معزز قریشی خاندان میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول شکر درہ میں تعلیم پائی۔ فوجی ملازمت کے دوران جب آپ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں تھے تو پہلا ڈرامہ مجاہد لکھا اور اس سٹیج بھی کیا۔ ۱۹۳۹ء میں اپنا پہلا افسانہ "لڑکی" لکھا۔ جو فوجی اخبار میں شائع ہوا جسکے ایڈیٹر آغا بابر تھے۔ انہوں نے ان الفاظ میں حوصلہ افزائی کی۔ "اگر یہ نقش اول ہے تو نقش ثانی خدا جانے کیا ہوگا۔ اگر تم نے افسانوں میں مشق ترک کی تو اردو ادب پر ظلم عظیم ہوگا" (۱۳۶)

رحیم گل نے پشتو کی دو ابتدائی فلموں عجب خان آفریدی اور موسیٰ خان گل مکئی کی کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے ہیں۔ ان کے اردو ناولوں کے نام یہ ہیں۔ تن تارا را، جنت کی تلاش، داستان چھوڑ آئے، وادی گمان میں، زہر کا دریا۔ اس کے علاوہ رحیم گل کے خاکوں کا مجموعہ "پورٹریٹ" بھی شائع ہوا ہے۔ افسانے کے میدان میں طاہر آفریدی، عبدالکافی ادیب، زیتون بانو اور سحر یوسفزئی ثقافت اور عورت کی نفسیات پر کئی اچھے افسانے ملتے ہیں۔ برگ آرزو زیتون بانو کا مطبوعہ ناول ہے اور برگد کا سایہ غیر مطبوعہ ناول ہے۔ اشرف درانی نے ایک رومانی ناول "جنت البوبی" کے نام سے شائع کیا ہے۔ طاہر آفریدی کا مجموعہ "ریدن" میں زیادہ افسانے پشتونوں کے دیہاتی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ عبدالکافی ادیب کے افسانے "ٹیڑھے چہرے" بھی سماجی مسائل کے آئینے میں معاشرے کے بہت سے ٹیڑھے چہروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ سحر یوسفزئی کے "سائے" اور ڈاکٹر آصف حلیم کا مجموعہ "موتی مرے ہوئے" بھی اپنی انفرادیت کے حوالے سے قابل ذکر ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی صفیہ بشیر گنڈہ پور نے "زرخوند" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ہے جو انسان کو متحرک رکھنے کا پیغام دیتا ہے۔ ڈرامے کے میدان میں جن پشتون اہل قلم نے طبع آزمائی کی ہے ان میں امیر حمزہ شنواری، اجمل خٹک، خیال بخاری، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، فضل رضا، سعد اللہ جان برق، محمد ہمایوں ہما، خزاں اللہ نگار اور کرزئی، یونس قیاسی اور نوید بشر کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ "اس حمام میں" ایوب صابر کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

تاریخ

روشن خانے "تذکرہ" کے نام سے پٹھانوں کی اصلیت کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کاکا خیل نے ایک کتاب "پشتون اپنی نسل کے آئینے میں" کے نام سے لکھی ہے۔ یہ دونوں حوالے کی کتابیں ہیں لیکن زیادہ مستند کتاب "پشتون اپنی نسل کے آئینے میں" مانی جاتی ہے۔ عقاب خٹک نے تاریخ خٹک لکھ کر اپنی تاریخ فہمی کا ثبوت تو دیا ہے لیکن ان کی کتاب کو سند کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ وزیر مبارک بابا کے حوالے سے عقاب ہی کی کتاب اور ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ کی کتاب "تذکرہ پیر مبارک" قابل داد بھی ہے اور وقیع بھی۔ عقاب خٹک اور بہادر شاہ ظفر کاکا خیل نے شیخ رحمکار حضرت کاکا صاحب کی سوانح پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے۔ پریشان خٹک نے پشتون کون؟ کے نام سے ایک اچھی کتاب لکھی ہے۔

تحقیق وتنقید

تحقیق وتنقید کے میدان میں سب سے معتبر نام دوست محمد کامل کا ہے۔ انہوں نے خوشحال خان خٹک پر جو کتاب لکھی ہے اگر چہ اس میں تاریخ بھی ہے لیکن مجموعی حوالے سے یہ کتاب تحقیقی و تنقیدی ہے جو خوشحال خان خٹک کے حالات زندگی اور شاعری کے فنی تجزیے پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر چراغ حسین شاہ نے چند تحقیقی مقالات کے ساتھ اپنا نام اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ پرویز شاہین نے لسانیات کے حوالے سے کچھ کام کیا ہے اور ساتھ ہی آرکیالوجی، جغرافیہ اور تاریخ میں بھی اچھی خاصی تحقیق کی ہے۔ انوارالحق جیلانی نے پشتون ثقافت کے حوالے سے "پشتو نامہ" لکھی ہے اور کئی مقالات بھی تحریر کیے ہیں۔ اس طرح خیال بخاری اور مولانا عبدالقادر کے تحقیقی مقالات بھی قابل ذکر ہیں۔

"سنگ میل سرحد نمبر" کے حوالے سے کئی پشتون اہل قلم نے تحقیقی وتنقیدی مقالات لکھ کر اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ سعد اللہ خان ایڈووکیٹ کی کتاب "تین اہم شاعر" میں رحمٰن بابا، حسین اور حافظ الپوری کی فنی سرگرمیوں پر تنقیدی رائے دی گئی ہے۔ پروفیسر افضل رضا نے اردو کے قدیم پشتون شعراء کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ عبدالرؤف نوشہروی نے پشتو ادب ایک تعارف کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ ایوب صابر نے جدید پشتو ادب کے نام سے کتاب لکھنے کے علاوہ کئی مقالات متفرق موضوعات پر لکھے ہیں۔ اسیر منگل کی کتاب پشتو افسانے کے سو سال بھی ایک قابل قدر

کتاب ہے۔

شیر افضل بریکوٹی کی کتاب "پیر روخان" بھی ایک تحقیقی کاوش ہے۔ عبدالحلیم اثر، فضل حق سید، سید تقویم الحق کاکا خیل، قلندر مومند، نواز طائر، بخش خلیل، طاہر بخاری، راج ولی شاہ خٹک، علی زرخان، محبت خان بنگش، شیرین زادہ خدوخیل، قسیم سرحدی، ماشام خٹک، فیروز خان صادق، قیوم مروت، فضل ربی راہی، ریاض تسنیم، یوسف خان یوسف، ماہر افغانی، خالد خان خٹک، عبدالکریم بریالے، فضل معبود، قاضی سرور، عبد شاہ عابد، ڈاکٹر سہیل انشاء، سلیم راز، اکمل اسد آبادی، فضل دین خٹک، فیض محمد شہزاد، اظہار اللہ اظہار، علی کمیل قزلباش، فضل محمود روخان اور محمود ایاز وغیرہ ایسے اہل قلم ہیں جن کے مضامین و مقالات متفرق موضوعات پر مختلف اخبارات و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔

دینی ادب

اردو کے دینی ادب میں شیر افضل بریکوٹی، میاں طاہر شاہ قادری اور فقیر محمد عباس قادری نے مذہبی و روحانی شخصیات جیسے پیر بابا، اخوان درویزہ بابا اور پیر روشن وغیرہ پر کتابیں لکھنے کے علاوہ کئی دینی موضوعات پر مقالات بھی لکھے ہیں۔ پروفیسر انعام اللہ جان قیس نے تفہیم۔ افکار، فتنہ انکار حدیث اور رحمت کائنات کی عالمگیر تابانیاں کے موضوعات پر کتابیں شائع کی ہیں جو بہت قابل قدر ہیں۔ حافظ شریف احمد افغانی نے دور اسلام اور اللہ کا ولی کامل کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں۔ میر احمد شاہ رضوانی نے علامہ اقبال کے ساتھ خطوط کے ذریعے تبادلہ خیال کیا ہے لیکن اس کا ریکارڈ دستیاب نہیں ہے۔ البتہ ان کی دو کتابیں اسلام کے بنیادی اصول اور پشتو گرامر مطبوعہ ہیں۔

متفرق موضوعات

امیر حمزہ شنواری نے وجود و شہود، تااور علم، انسان اور زندگی کے موضوعات پر لکھ کر تصوف و فلسفہ کے میدان میں گراں قدر کتابیں فراہم کیں۔ اردو میں اپنی سوانح عمری بھی لکھی ہے جو تاحال شائع نہیں ہوئی۔ البتہ خاطر غزنوی نے ان کے ساتھ ایک طویل انٹرویو کے ذریعے ان کے حالات زندگی اور فنی سرگرمیوں کے بارے میں خاطر خواہ مواد حاصل کر کے داستان امیر حمزہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ کئی ادیبوں کے نام اردو میں سینکڑوں خطوط کے ذریعے اس میدان میں بھی بہت اضافہ کیا ہے جن کے نام

خطوط لکھے ہیں ان میں رئیس امروہوی، صبا اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، فارغ بخاری اور انیس جیلانی کے نام فہرست ہیں۔

دوست محمد کامل کے اردو خطوط شائع ہوئے ہیں۔ موسیٰ خان، الافروی نے سیاسی موضوعات پر چند اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ غنی خان کی ایک کتاب "خان صاحب" اسلوب کے حوالے سے اردو ادب میں ایک منفرد اضافہ ہے۔ چند لکھنے والوں نے کالم نگاری کے صنف میں ادبی مواد فراہم کیا ہے۔ جن میں اجمل خٹک، بخش خلیل، خواجہ محمد سائل، قلندر مومند، ایوصابر، سعداللہ جان برق، ہمایوں ہما، سلیم راز، حماد حسن، یاسین یوسفزئی، مقدم خان معصوم، سرور سودائی، عمر گل عسکر، ذوق سرور، پریشان داوڑئی، وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

حوالہ جات

1۔ خٹک، پریشان، پروفیسر، پشتو شاعری کی تاریخ کا جائزہ، ادبیات اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۸، ص ۱۱

2۔ Envelodsor J Jens, Sound the bells, O moon arise and shine, University book Agency Peshawar

3۔ طاہر، محمد نواز، پروفیسر، پشتو زبان و ادب ایک مطالعہ، پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹، ۲۰۔

4۔ خلیل، حنیف، اردو کی تشکیل میں پشتونوں کا کردار، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۱، ۲۰۱۔

5۔ خلیل، حنیف، مختصر تاریخ زبان و ادب پشتو، ادارہ فروغ قومی زبان، اشاعت دوم ۲۰۱۹ء، ص ۴۲، ۴۳۔

6۔ خلیل، حنیف، پشتو زبان و ادب کی تاریخ، اعراف پرنٹرز پشاور، اشاعت دوم فروری ۲۰۱۹ء، ص ۴۴۳، ۴۴۴۔

7۔ ایضاً، ص ۱۹۷، ۲۰۶۔

8۔ ایضاً، ص ۴۳۱، ۴۳۲۔

9۔ ایضاً، ۴۶۲، ۴۶۳۔

10۔ ایضاً، ص ۴۷۰۔

11۔ ایضاً، ص ۴۹۵۔

12۔ ایضاً، ص ۵۰۸۔

13۔ ایضاً، ص ۵۸۲، ۵۸۳۔

14۔ ایضاً، ص ۵۸۸، ۵۸۹۔

15۔ ایضاً، ص ۴۹۷، ۴۹۸۔

16۔ خلیل، حنیف، پشتو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات، غزنوی پبلشرز کوئٹہ ۲۰۱۲ء، ص ۸۸، ۸۹۔

17۔ خلیل، حنیف، ڈاکٹر، پشتو ناول، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، (عصمت سورانی) افغان پشتو ادبی جرگہ پشاور، ۲۰۱۹ء، ص ۳۶، ۴۷۔

18۔ خلیل، حنیف، پشتو زبان و ادب کی تاریخ، اعراف پرنٹرز پشاور، اشاعت دوم ۲۰۱۹ء، ص ۴۷۵۔

19۔ خلیل حنیف، پشتو ناول، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ص ۶۷ تا ۷۳۔

20۔ ایضاً، ص ۷۴، ۷۵۔

21۔ ایضاً، ص ۸۸، ۸۹۔

22۔ خلیل، حنیف، پشتو زبان و ادب کی تاریخ، ص ۴۷۷، ۴۷۸۔

23۔ ایضاً، ص ۵۴۳ تا ۵۵۲۔

24۔ صابر، ایوب، جدید پشتو ادب، پشتو ادبی مرکز سرائے نورنگ، (س ن)، ص ۱۹۶، ۱۹۷۔

25۔ خلیل، حنیف، پشتو زبان و ادب کی تاریخ، ص ۴۷۸۔

26۔ خٹک، پریشان، پشتو کا عصری ادب (مشمولہ) پاکستانی ادب (پہلی جلد)، مرتبہ رشید امجد، فاروق علی فیڈرل گورنمنٹ کالج راولپنڈی، ۱۹۸۱ء، ص ۷۷۶، ۷۷۷۔

27۔ ایضاً، ص ۷۷۹۔

28۔ صابر، ایوب، جدید پشتو ادب، ص ۱۸۳، ۱۸۴۔

29۔ منگل، امیر، پشتو افسانے کے سو سال، منگل کتاب کور پشاور، بار دوم ۲۰۱۷ء، ص ۴۷۔

30۔ منگل، امیر، پشتو افسانے کے جدید رجحانات (مشمولہ)، پشتو ادب کے جدید رجحانات (مرتبہ عبداللہ جان عابد)، یونیورسٹی پبلشرز پشاور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

31۔ محمدی، میر محمدی شاہ، تنگ پہ تنگ (رویرہ)، مرتبہ حنیف خلیل، دانش کتاب خانہ پشاور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶، ۱۷۔

32۔ صابر، ایوب، جدید پشتو ادب، ص ۱۸۸، ۱۸۹۔

33۔ ایضاً، ص ۱۸۲، ۱۸۵۔

34۔ ایضاً، ص ۱۹۱، ۱۹۲۔

35۔ قمر لیاش بی کمل، پشتو ادب آزادی تا ۲۰۰۰ء، (مشمولہ) سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، جلد ۱، شمارہ نمبر ۵۷، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۰۔

36۔ رؤف، بیگم منور، پاکستانی ادب میں خواتین کا کردار، (مرتب) ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۷۰۔

37۔ قاسمی، احمد ندیم، از زیتون بانو، شخصیت اور فن (مرتبہ) احمد پراچہ، مکتبہ ارژنگ پشاور (سن)، ص ۱۲۵۔

38۔ جیلانی کامران، از زیتون بانو شخصیت اور فن، ص ۹۶۔

39۔ بانو، زیتون، زیتون بانو شخصیت اور فن، ص ۱۲۸۔

40۔ رؤف، بیگم منور، پاکستانی ادب میں خواتین کا کردار، ص ۷۰۔

41۔ ایضاً، ۷۱، ۷۲۔

42۔ ایضاً، ۷۵۔

43۔ منگل، اسیر، پشتو ادب کے جدید رجحانات، ص ۱۲۳۔

44۔ ایضاً، ص ۱۲۴، ۱۲۵۔

45۔ صابر، ایوب، جدید پشتو ادب، ص ۱۶۷، ۱۶۸۔

46۔ خلیل، حنیف، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب پشتو، (اشاعت دوم) ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۹ء، ص ۱۸۷۔

47۔ ایضاً، ص ۱۹۴، ۱۹۵۔

48۔ ایضاً، ص ۱۹۶، ۱۹۷۔

49۔ وفا، محمد داؤد، د پشتو معاصر ادب تاریخ (پشتو کے معاصر ادب کی تاریخ)، مومند خپرندویہ ٹولنہ، جلال آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۹۰، ۱۹۱۔

50۔ ایضاً، ص ۱۹۳۔

51۔ ایضاً، ۱۹۳، ۱۹۵۔

52۔ خلیل، حنیف، کاکاجی صنوبر شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۹۹۔

53۔ خلیل، حنیف، بابائے غزل، پاگرام ادبی جرگہ پشاور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۵۰، ۲۵۱۔

54۔ خلیل، حنیف، مختصر تاریخ زبان و ادب پشتو، ادارہ فروغ قومی زبان، اشاعت دوم، ۲۰۱۹ء، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

55۔ ایضاً، ص ۱۳۶، ۱۳۷۔

56۔ صابر، ایوب، جدید پشتو ادب، ص ۱۲۹، ۱۳۰۔

57۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

58۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

59۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

60۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

61۔ وفا، محمد داؤد، پشتو معاصر ادب تاریخ، ص ۲۵۸، ۲۵۹۔

62۔ کاکاخیل، سید محمد تقویم الحق، اجنبی پر اعتبار، (مشمولہ) سید تقویم الحق کاکاخیل، شخصیت اور فن (از حنیف خلیل) اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۲۱ء، ص ۱۴۲، ۱۴۳۔

63۔ صابر، ایوب، جدید پشتو ادب، ص ۱۰۷۔

64۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

65۔ ایضاً، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

66۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔

67۔ خلیل، محمد حنیف، ڈاکٹر سید تقویم الحق کاکاخیل شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۲۱ء، ص ۱۳۸، ۱۳۹۔

68۔ مجاہد، صنوبر حسین کاکاجی، روزا آشنا (پرانا یار) (مشمولہ) ماہنامہ اسلم، ستمبر ۱۹۵۴ء، ص ۱۵۔

69۔ صابر، ایوب، جدید پشتو ادب، ص ۱۲۵۔

70۔ ایضاً، ص ۱۲۲، ۱۲۳۔

71۔ وفا، محمد داؤد، پشتو معاصر ادب تاریخ، ص ۲۹۷، ۲۹۸۔

72۔ کاکاخیل، سید محمد تقویم الحق، حافظ صاحب زما ملگرے (حافظ صاحب میرا دوست) مشمولہ

غوروئیلونہ (بہترین تحریریں)، مرتبہ ڈاکٹر محمد ہمایوں ہما، کوثر پرنٹنگ پریس مردان، ۲۰۰۷ء،
ص ۳۱۱۔

73۔ ایضاً، ص ۳۱۵۔

74۔ کاکاخیل، سید تقویم الحق، عبدالقدوس قاسمی، مشمولہ "پشتو" مجلہ (اعتراف نمبر)، جلد نمبر ۱۰، شمارہ نمبر ۱۰، ۱۱، نومبر ۱۹۷۸ء، ص ۳۵۴۔

75۔ کاکاخیل، سید محمد تقویم الحق، قلندر مومند (مشمولہ) غوروئیلونہ، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔

76۔ حسرت، زبیر، ڈاکٹر، پشتو تحقیق کے جدید رجحانات، (مشمولہ) پشتو ادب کے جدید رجحانات
(مرتبہ عبداللہ جان عابد)، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

77۔ ایضاً، ص ۱۵۲، ۱۵۳۔

78۔ خلیل، حنیف، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب پشتو، ادارہ فروغ قومی زبان، طبع دوئم ۲۰۱۹ء،
ص ۳۱۵، ۳۱۶۔

79۔ راز، سلیم، راز کی باتیں (مولفہ صفدر علی صائم)، اعراف پرنٹرز پشاور، ۲۰۱۸، ص ۱۱۲۔

80۔ عارف، افتخار، وثیق نامہ (مشمولہ) کاکاجی صنوبر: شخصیت اور فن، ص ۹۔

81۔ خلیل حنیف، کاکاجی صنوبر: شخصیت اور فن، ص ۸۷۔

82۔ Raz Saleem Sanobar Hussain KakajiJ 47 death anniversary celebrated, the statesman, Jan 4, 2005

83۔ راز، سلیم، پشتو نے انقلابی (چیا انقلابی)، مشمولہ تنقیدی کرے، ماسٹر پریس پشاور، ۱۹۹۹ء،
ص ۵۶۔

84۔ کامل، دوست محمد خان، کاکاجی ہمارے ادبی اجلاسوں میں، مشمولہ کاکاجی صنوبر حسین
دانشوروں کی نظر میں، (مرتبہ انور خان دیوانہ)، ۱۹۹۳ء، ص ۹۔

85۔ ہمدانی، رضا، کاکاجی صنوبر حسین دانشوروں کی نظر میں، ص ۲۴۔

86۔ راہی، قمر، کاکاجی صنوبر حسین دانشوروں کی نظر میں، ص ۳۸۔

87۔ مہمند، قلندر، کاکاجی صنوبر حسین دانشوروں کی نظر میں، ص ۵۵۔

88۔ شنواری، حمزہ خان، کاکاجی صنوبر حسین دانشوروں کی نظر میں، ص ۷۱۔

89۔ صابر ایوب، جدید پشتو ادب، ص ۱۵۵۔

90۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔

91۔ خان، میر عبدالصمد، دیباچہ (مشمولہ) جدید پشتو ادب، ص ۳۳، ۳۴۔

92۔ وفا، محمد داؤد، پشتو معاصر ادب تاریخ، ص ۳۵۲۔

93۔ ایضاً، ص ۳۵۳، ۳۵۴۔

94۔ فیض، فیض الوہاب، پشتو تنقید کے جدید رجحانات (مرتبہ عبداللہ جان عابد)، ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

95۔ شاحسین، سلمیٰ، جدید نظم پہ پشتو کے (جدید نظم پشتو میں) پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی، ص ۳۹۶۔

96۔ خلیل، حنیف، آئینے، دانش کتب خانہ پشاور، ۲۰۰۱ء، ص ۷۷۔

97۔ خلیل، حنیف، پرتپ پرشہ، باکرام ادبی جرگہ پشاور، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳۔

98۔ اظہار، اظہار اللہ، متوازی زوالی تصویر پر خوب اووکاوے، جنوری ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۔

99۔ خلیل، حنیف، پشتو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات، غزنوی پبلشرز کوئٹہ، ۲۰۱۲ء، ص ۴۹۳ تا ۴۹۹۔

100۔ گوہر، اسماعیل، پشتو نظم میں جدید رجحانات کا ورود (مشمولہ) پشتو ادب کے جدید رجحانات، ص ۷۲، ۷۳۔

101۔ سلیم، سیف الرحمٰن، دوڑ دوڑ دا یا لودے بندہ کڑم، یونیورسٹی پبلشرز پشاور، ۲۰۰۸ء، ص ۸۔

102۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔

103۔ سیال، علی اکبر، دوئم سوز پکلی کے شرح جذو ولی، پشتون کلچرل ایسوی ایشن اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۷۸۔

104۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

105۔ ایضاً، ص ۱۰۔

106۔ ایضاً، ص ۱۹۔

107۔ ایضاً، ص ۱۸۔

108۔ ایضاً، ص۹۳۔

109۔ زیار، خالق، ڈاکٹر (مقدمہ) مشوانہ، موزپکلی کے شرمہ جوڑ وئی، ص۴۔

110۔ درانی درویش، پکوانی کے حنداره، صحاف اشراقی موسسہ کوئٹہ، ۲۰۰۲ء، ص۴۷۔

111۔ مقدر، مقدر شاہ، دگلونو پاڑبری، محکمہ ثقافت، خیبر پختونخوا، ۲۰۱۹ء، ص۸۷۔

112۔ ایضاً، ص۷۶۔

113۔ داخویزے، شباب، پہ تیمولمو وقفات ادبی ٹولنہ، ۲۰۱۰ء، ص۷۰،۸۔

114۔ ایضاً، ص۳۷۔

115۔ ایضاً، ص۴۷۔

116۔ درد، رحمت اللہ، منتخب درد، افضل پرنٹنگ پریس پشاور، ص۳۸۔

117۔ تسنیم، ریاض، دوکوم رنگ سے کشید کڑے، جرس ادبی جرگہ کراچی، ۲۰۰۲ء، ص۳۸۔

118۔ آفریدی، قیصر، کل نوموند عشق نوروی، جرس ادبی جرگہ کراچی، ۲۰۱۰ء، ۱۳۲،۱۳۳۔

119۔ بوتیری، طاہر، مذکورہ کے وساکوسوک دی، جرس ادبی جرگہ کراچی، ۲۰۰۲ء، ص۱۰۲۔

120۔ ایضاً، ص۳۰۔

121۔ ایضاً، ص۳۰۔

122۔ احساس، جاوید، سرچینہ، معیار ادبی جرگہ بنوں، ۲۰۱۰ء، ص۳۷۔

123۔ ایضاً، ۲۳۰۔

124۔ ایضاً، ص۲۳۸۔

125۔ مندوخیل، داود بخت، د حیلو ذیوے، ویش لیکوال ادبی ٹولنہ ژوب، ۲۰۰۹ء، ص۶۷۔

126۔ مندوخیل، رحمت زلمے، د تورو چپاو کے، ویش لیکوال ادبی ٹولنہ ژوب، ۲۰۰۷ء، ص۳۰۔

127۔ امیر، بخت شیر، یاقی گلکرونہ، افغان گمدون لیکوال ملگری ژوب، ۲۰۰۷ء، ص۳۹۔

128۔ ایضاً، ص۳۰۔

129۔ ایضاً، ص۶۹۔

130۔ ایضاً، ص۶۵۔

131۔ جلمی وال، امیر صادق (غیر مطبوعہ کلام)۔

132۔ سلطان، سلطان محمد (غیر مطبوعہ کلام)۔

133۔ ایضاً۔

134۔ عزیز، فضل احمد، دفرہ بگوت، ادبی مرکز سرائے نورنگ، ۱۹۹۱ء، ص ۹۷۔

135۔ شنواری، امیر حمزہ، بحوالہ بابائے غزل (از حنیف خلیل)، یاگرام ادبی جرگہ پشاور، ۱۹۸ء، ص ۲۱۲۔

136۔ کنڈان، شاکر کنڈان، اردو ادب اور عساکر پاکستان ادارۂ فروغ ادب سرگودھا، ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۸۔

☆☆☆